جلد نمبر 3
شمارہ نمبر 3
جولائی 2023
المنار
مجلس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اس شمارے میں

پتہ برائے خط و کتابت

editorAlmanar@gmail.com

Click Here to visit TICAA USA **Website**

Click her to visit us on **facebook**

وَلَا تُصَعِّرۡ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمۡشِ فِي الۡاَرۡضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ ۚ﴿19﴾

اور (نخوت سے) انسانوں کے لئے اپنے گال نہ پُھلا اور زمین میں یونہی اکڑتے ہوئے نہ پھر۔ اللہ کسی تکبر کرنے والے (اور) فخر ومباہات کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

وَاقۡصِدۡ فِيۡ مَشۡيِكَ وَاغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِكَ ؕ اِنَّ اَنۡكَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِيۡرِ ﴿20﴾

اور اپنی چال میں میانہ رَوی اختیار کر اور اپنی آواز کو دھیمار کھ۔ یقیناً سب سے بُری آواز گدھے کی آواز ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ کی خاطر ایک درجہ تواضع اختیار کی اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ رفع کرے گا یعنی اس کو ایک درجہ بلند کرے گا۔ جس نے عاجزی اختیار کی اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرے گا یہاں تک کہ اسے علّیّین میں جگہ دے گا۔ اور جس نے اللہ کے مقابل پر ایک درجہ تکبّر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ایک درجہ نیچے گرادے گا یہاں تک کہ اسے اسفل سُفلین میں داخل کر دے گا۔

(مسند احمد بن حنبل باقی مسند المکثرین من الصحابۃ)

چوہدری نصیر احمد

بیت الاسلام مسجد کینیڈا کی تاریخ کا ایک ورق

حکیم محمد سعید صاحب شہید کی کینیڈا کی بیت الاسلام مسجد میں یادگار آمد کا ذکر خیر

حکیم محمد سعید

یہ 1991ء کی بات ہے جب بیت الاسلام مسجد کی تعمیر پورے زوروں پر تھی کہ میرے بزرگ دوست مکرم سید حسنات احمد صاحب نے مجھ سے ذکر کیا کہ محترم حکیم محمد سعید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ کراچی پاکستان آجکل کینیڈا کے دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ میں ان سے ذاتی طور پر تو متعارف نہ تھا لیکن کون پاکستانی ہو گا جس نے ان کا نام نہ سن رکھا ہو۔ دیسی اور یونانی طریقہ علاج میں برصغیر پاک و ہند میں ہمدرد دواخانہ کراچی اور دہلی سے کون واقف نہیں۔ پھر شام ہمدرد کے تحت محترم حکیم صاحب کی ادبی سرگرمیاں اکثر اخباروں میں چھپتی رہتی تھیں جن کو میں جب پاکستان میں تھا تو بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ مجھے اشتیاق پیدا ہوا کہ حکیم صاحب سے کینیڈا میں ملاقات کرنی چاہیے۔ جب میں نے سید حسنات صاحب مرحوم سے اسکا ذکر کیا تو کہنے لگے کب

ملنا چاہتے ہو۔ میں حیران ہوا کہ اسقدر یقین سے کہہ رہے ہیں جیسے معمولی بات ہو۔ جب میں نے یہ پوچھا کہ آپ حکیم صاحب کو کیسے جانتے ہیں تو فرمانے لگے کہ دہلی کے زمانہ سے ہمارے قریبی خاندانی تعلقات ہیں اور میں حکیم صاحب سے وقت لے کر تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ میں تو بہت خوش ہوا۔ ایک دو روز بعد مکرم سید حسنات صاحب کا فون آگیا کہ ملاقات کا وقت مل گیا ہے اور پھر ہم دونوں ان کی رہائش گاہ پر چلے گئے۔ حکیم صاحب اپنے جاننے والے ایک خاندان مسز ڈیسوزا (Mrs. De Soza) کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو حکیم صاحب اپنے روایتی لباس سفید اچکن، سفید چوڑی دار پاجامہ، ہاتھ میں تسبیح، سر پر کالی جناح ٹوپی اور پاؤں میں سفید جوتے پہنے ہوئے تھے۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ ملاقات رہی۔ پہلے کچھ سرسری تعارفی باتیں ہوئیں پھر انہوں نے اپنے مختلف سفروں کی باتیں کیں اور کینیڈا آنے کی غرض غایت بیان کی۔ انہوں نے بتایا کی وہ ایک بڑی یونیورسٹی مدینتہ الحکمت کے نام سے کراچی میں بنا رہے ہیں اور اس سلسلہ میں دوست واحباب سے چندہ وغیرہ بھی اکھٹا کر رہے ہیں۔ پھر مجھ سے کچھ سوالات کیے کہ کہاں کا رہنے والا ہوں اور کب سے یہاں آیا ہوا ہوں اور کیا تعلیم اور پیشہ ہے۔ میں نے پہلے اپنا مختصر تعارف کرایا پھر کہا کہ آجکل یہاں کینیڈا کی سب سے بڑی مسجد تعمیر کر رہا ہوں جو جماعت احمدیہ کی اس ملک میں پہلی مسجد ہو گی۔ بڑی دلچسپی کے ساتھ ساری بات سنی اور کچھ سوالات بھی کیے۔ میں نے محسوس کیا کہ حکیم صاحب کو مساجد میں خصوصی دلچسپی ہے اور اسکو دیکھتے ہوئے میں نے ان کو دعوت دی کہ آپ ہماری زیر تعمیر مسجد کو آکر دیکھیں اور اگر وقت اجازت دے تو ہم ایک شام ہمدرد قسم کی محفل کا انتظام کر سکتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ اس دورہ میں وقت بہت کم رہ گیا ہے لیکن اگلی دفعہ جب آؤں گا تو مسجد بھی دیکھوں گا۔ میں اس بات کو ایک خالی خولی وعدہ ہی سمجھا کہ کیا معلوم کب دوسرا دورہ ہو اور اسوقت کیا حالات ہوں۔ ملاقات ختم ہو گئی۔

کچھ دنوں بعد حکیم صاحب واپس چلے گئے اور میں دوبارہ تعمیر مسجد میں مصروف ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں دوسرے حصہ کو بیان کروں مناسب ہو گا کہ قارئین کی دلچسپی کے لیے محترم حکیم محمد سعید صاحب کا کچھ مناسب تعارف بھی کروادوں کہ وہ کیسی شخصیت تھے جن کی ملاقات کی خواہش مجھے پیدا ہوئی۔

حکیم محمد سعید صاحب کو ملنے اور دیکھنے سے ان کے چہرہ سے نامعلوم قسم کی ہلکی سی جھلک کچھ چینی خدوخال کی سی ملتی تھی۔ ان کے خاندانی تعارف کا کچھ خاکہ جو میں نے مختلف ذرائع سے حاصل کیا ہے یہ ہے کہ حکیم صاحب کے آباؤاجداد کوئی چار صدیاں پہلے، غالباً سترھویں صدی کے شروع میں، چین کے شہر سنکیانگ سے ہجرت کر کے پہلے پشاور آباد ہوئے، پھر اسی، سو سال بعد پنجاب میں ملتان کے علاقہ میں ایک صدی سے زیادہ عرصہ، (کئی جگہ لکھا ہے 135 سال) رہنے کے بعد دہلی چلے گئے۔ آپ کے والد صاحب حکیم عبد المجید کی پیدائش 1883ء میں ہوئی۔ والدہ بھی نہایت وفا شعار، محنتی، صوم وصلاۃ کی پابند تھیں۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کو مادر ہمدرد کا خطاب عطا کیا۔ ہمدرد دواخانہ کی بنیاد انکے والد ماجد حکیم عبد المجید مرحوم نے ہی 1906ء میں دہلی میں رکھی اور اسکا خوب نام چمکا۔ حکیم سعید صاحب کی پیدائش جنوری 1920 میں دہلی میں ہوئی اور عمر بمشکل ڈھائی سال کی تھی کہ والد کا انتقال 39 سال کی عمر میں 1922ء میں ہو گیا۔ بڑے بھائی حکیم عبد الحمید صاحب نے پرورش کی۔ اُن کی زیر نگرانی دینی تعلیم حاصل کی اور قرآن بھی حفظ کیا۔ اسکے بعد بڑے بھائی صاحب نے طب کا

پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا، اسطرح سولہ سال کی عمر میں حکیم محمد اجمل خاں کے آیورویدیک اور یونانی طبیہ کالج دہلی میں داخلہ لے لیا۔ طبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دہلی یونیورسٹی سے فارمیسی میں ڈگری لی، اور پھر میڈیکل کیمسٹری میں بھی ایک ڈگری حاصل کی، پھر اسی یونیورسٹی سے فارمیسی کے مضمون میں ایم اے بھی کیا۔ 1952ء میں انہوں نے انقرہ، ترکی، سے پی ایچ ڈی (PhD) کی بھی ڈگری فارمیسی میں حاصل کی اور کچھ عرصہ سندھ یونیورسٹی میں کیمسٹری بھی پڑھاتے رہے۔ عام لوگوں کو معلوم نہیں لیکن وہ دینی اور دنیاوی دونوں لحاظ سے ایک بہت پڑھے لکھے عالم با عمل انسان تھے۔ چونکہ اپنے بڑے بھائی حکیم عبد الحمید کی ترغیب سے طب کا پیشہ اختیار کیا اس لیے پہلے انکے ساتھ ہی بطور طبیب کام شروع کر دیا۔ جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی تو بڑے بھائی نے تو دہلی میں ہی قیام کرنے کا فیصلہ کیا لیکن حکیم محمد سعید صاحب نے پاکستان آکر ہمدرد دواخانہ قائم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اسطرح نہایت بے سروسامانی کے عالم میں 9 جنوری 1948ء کو ہندوستان کو ہمیشہ کیلئے خیر آباد کہہ کر کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ جون 1948ء میں اپنے دواخانہ کا افتتاح کر دیا۔ اسوقت حکیم صاحب کی عمر صرف اٹھائیس 28 برس تھی۔ ہجرت کی مشکلات کے باعث کچھ ملازمت وغیرہ کی بھی کوشش کی۔ ایک پرائمری سکول بھی گئے اور کہا کہ میں حافظ قرآن بھی ہوں اور استاد کی حثیت میں ملازمت چاہتا ہوں، مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ اسطرح کی مزید کوششوں سے ایک سکول میں چھ ماہ کی ملازمت بھی کی۔ لیکن اس عرصہ میں یہ ارادہ بھی کر لیا کہ میں مستقبل میں ایک مدرسہ بھی قائم کروں گا۔ دواخانہ میں دواسازی کے ساتھ طب کا کام بھی جاری رکھا اور اللہ نے بہت برکت دی اور وقت گزرنے کے ساتھ ہر شہر میں ہمدرد دواخانہ کی شاخیں کھل گئیں۔ چونکہ اپنے پیشہ سے منافع پیدا کرنا غرض نہیں تھی اس لیے 1953ء میں ہمدرد دواخانہ کو ایک وقف میں تبدیل کر دیا اور پھر ہمدرد فاؤنڈیشن کی بنیاد 1956ء میں رکھی۔ 1985ء میں انہوں نے ہمدرد یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ جسکو بعد میں مدینتہ الحکمت کے بڑے پراجیکٹ میں شامل کر دیا۔ آجکل پاکستان میں یہ ایک بہت بڑا ادارہ بن گیا ہے جس میں سائنس، میڈیکل، قانون، اسلامی علوم، انتظامیات، دیسی ادویات اور طریقہ علاج، انجنیئرنگ، ٹیکنالوجی، وغیرہ سب علوم میں ڈگریاں ملتی ہیں۔ انکی لائبریری پاکستان کی بہترین لائبریری تصور ہوتی ہے۔ کوئی دو سو کے قریب کتب خود لکھیں یا ان کو ترتیب دیا۔ بے شمار اعلی درجہ کے رسائل جاری کئے جن میں بعض عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ دیسی طریقہ علاج کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کروایا اور اسکو یونائیٹڈ نیشن (UNO) کی صحت کی عالمی تنظیم WHO سے بھی منوایا۔ جتنی بھی دولت کمائی تمام کو قوم کی خدمت میں وقف کا ادارہ بنا کر وقف کر دیا۔ ان کے بارہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس دن مریضوں کو دیکھتے تھے اس دن روزہ رکھتے تھے تاکہ مریض دیکھنے میں بیجا خلل نہ ہو۔ اسی طرح جب خود مریض دیکھتے خواہ امیر ہو یا غریب بطور طبیب اپنی فیس نہ لیتے۔ جڑی بوٹیوں سے دیسی دواسازی کا کارخانہ قائم کیا تھا اور ہمدرد کی انکم انہیں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ ہمدرد کا بنا ہوا نونہال گرائپ واٹر پاکستان میں کس بچے نے نہیں پیا؟ پھر کتابوں کے پبلشر بھی بن گئے تھے اور خاص کر ہمدرد کی بچوں کی کہانیوں کی کتابیں تو بہت مشہور تھیں۔ تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم کو عام کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔

اس مختصر تعارف کے بعد اب دوبارہ پہلی کہانی کی طرف آتا ہوں۔ بیت الاسلام مسجد کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اکتوبر 1992ء میں اسکا

افتتاح بھی ہو گیا۔ چند ماہ مجھے حساب کتاب مکمل کرنے میں لگ گئے۔ اب جیسا کہ مجھے یاد پڑتا ہے غالباً مارچ یا اپریل کا مہینہ تھا اور ابھی برف پگھلی نہ تھی کہ ایک دن مجھے مکرم حسنات صاحب کا فون آیا کہ حکیم صاحب دوبارہ کینیڈا تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ پچھلی دفعہ حکیم صاحب وعدہ کر گئے تھے کہ آپ کی مسجد بھی آؤں گا۔ اور جب حکیم صاحب سے ملاقات ہو تو انہیں یہ وعدہ یاد دلا دیں۔ اب دیکھیے اصل بڑے لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ ائیر پورٹ پر بہت سے لوگ حکیم صاحب کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے اور ان میں مکرم حسنات صاحب بھی تھے۔ یہ روایت مجھے ان کی ہی زبانی معلوم ہوئی کہ جوں ہی حکیم صاحب مکرم حسنات صاحب کو ملے تو خود ہی فرمایا کہ پچھلی دفعہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کی مسجد بھی دیکھوں گا۔ اب تو مکمل ہو گئی ہو گی۔ دو دن بعد آپ پروگرام رکھ لیں۔ یعنی ایک دن وارد ہوتے ہیں، دوسرا دن سفر کی تھکن کی وجہ سے آرام کرتے ہیں (ان کی عمر اسوقت 73 سال تھی) اور پہلی ہی فرصت میں اپنے وعدہ کو پورا کرنے کے واسطے کہہ دیتے ہیں۔ کچھ گھنٹوں بعد مجھے مکرم حسنات صاحب کا فون آیا کہ میرے یاد دلانے سے پہلے ہی مکرم حکیم صاحب نے مسجد آنے کا دن اور وقت کا تعین کر دیا ہے اب تم یہ سب انتظام کرو۔ میں خوش بھی ہوا، متاثر اور حیران بھی کہ اتنی بڑی شخصیت ہیں اور وعدہ بھی یاد ہے۔ میں نے فوراً مکرم امیر جماعت مولانا نسیم مہدی صاحب کو فون پر اطلاع دی کہ استقبال کا کچھ انتظام کریں۔ انہوں نے جلدی جلدی مکرم نصیر خاں صاحب جو جماعت کے مستقل سیکرٹری ضیافت ہیں کو فون کر کے کچھ ضیافت کا انتظام کرنے کا کہا۔ اور ساتھ یہ بھی طے پایا کہ حکیم صاحب کی عزت افزائی کی خاطر کچھ اور احباب بھی بلوا لیے جائیں۔ اس استقبالیہ گروپ میں جو احباب شریک ہوئے ان میں مکرم امیر جماعت

نسیم مہدی صاحب، مکرم حسنات احمد صاحب، مکرم کرنل انور احمد صاحب، مکرم ملک حمید صاحب، مکرم ممتاز احمد صاحب مرحوم، مکرم کرنل دلدار احمد صاحب، مکرم چوہدری خلیل احمد صاحب مرحوم، مکرم یعقوب خاں صاحب اور راقم بھی شامل تھا۔ ہمارے ایک مستقل رضاکار فوٹو گرافر مکرم بشیر ناصر صاحب نے حسب معمول فوٹو گرافی کے فرائض ادا کیے اور ان لمحات کو بطور ہمیشہ کی یادگار کے محفوظ کر لیا۔ وقت مقررہ پر ایک سرخ رنگ کی وین میں مکرم حکیم صاحب کا قافلہ مسجد کے قریب آ کر رکا۔ مکرم حسنات صاحب، مکرم امیر صاحب اور راقم نے حکیم صاحب کے قافلہ کا استقبال کیا اور پھر باقی احباب نے بھی ان کے ساتھ مصافحہ کیا۔ حکیم صاحب کے قافلہ میں مسز ڈی سوزا، اور انکا بیٹا شامل تھا۔ حکیم صاحب حسب معمول اپنا دہلی والا لباس سفید اچکن، چوڑی دار پاجامہ، سفید جرابیں، ہاتھ میں سفید تسبیح اور سر پر کالی جناح ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔

مکرم حکیم صاحب نے ساری مسجد کو نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھا، ہر چیز کا بغور معائنہ کیا۔ مسجد نئی نئی بنی تھی، ہر چیز چمکدار اور صاف ستھری تھی۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے تعمیر اور ڈیزائین کی تفصیلات بتائیں۔ ہال وے، جوتے رکھنے کا نظام، مسجد کا مین ہال، بالکونی، عورتوں کا ہال، بچوں کا سپیشل کمرہ، اور پھر غسل خانے اور وضو کا انتظام وغیرہ سب چیزیں دیکھیں۔ آجکل تو مساجد کیلئے قطاروں والے کارپٹ مل جاتے ہیں لیکن جس زمانہ میں یہ مسجد بن رہی تھی اسوقت یہ نہیں بنتے تھے۔ میں نے صفیں سیدھی رکھنے کی خاطر دو مختلف رنگوں کے کارپٹ صفوں کی صورت میں لمبی

قطاروں کی شکل میں ہال میں بچھوائے تھے اسے دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے کہ اب صفیں ہمیشہ سیدھی رہیں گی۔ انہوں نے غالباً یہ طریقہ پہلی دفعہ دیکھا تھا کیونکہ اکثر بڑی اور مشہور مساجد میں عموماً مہنگے ایرانی ساخت کے کارپٹ ہوتے ہیں، جن میں ڈیزائن تو بہت خوبصورت ہوتے ہیں لیکن سیدھی قطار بنانا مشکل ہوتا ہے۔ ان دنوں بہت سے گروپس مسجد کو دیکھنے آتے تھے اور تعمیری تفصیلات جاننا چاہتے تھے اور مجھے بار بار ایک ہی سٹوری بیان کرنا پڑتی تھی۔ اسلئے میں نے ایک سلائیڈز پروجیکٹر (Slides Projector) خرید کر اس میں چنیدہ فوٹو ترتیب وار ڈال کر ایک تصویری سٹوری بنالی تھی جس کو دیکھنے سے ہماری تین سال کی محنت کی کہانی اور ساری تعمیر کی تفصیل تقریباً دس پندرہ منٹ میں مکمل ہو جاتی تھی۔ اور اسکو اسطرح ترتیب دیا تھا کہ مختلف حصے اپنی کہانی خود بتا دیتے تھے۔ مثلاً، گنبد کی تعمیر کے مراحل کیا تھے، مینارہ کن ادوار سے گزرا، مسجد کی دیواریں کن مراحل سے گزریں، وغیرہ وغیرہ۔ وہ سلائیڈ شو میں نے مکرم حکیم صاحب کو بھی دکھایا اور وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے بلکہ اس پروجیکٹر کے بارہ میں تفصیلات پوچھنا شروع کر دیں۔ پروجیکٹر چونکہ چھوٹا تھا اور با آسانی اسے ہر جگہ لے جایا جاسکتا تھا حکیم صاحب کو بہت پسند آیا۔ پھر کہنے لگے کہ میری عادت ہے کہ جب بھی کسی مسجد میں جاتا ہوں دو رکعت نماز ادا کرتا ہوں۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں یہاں بھی دو رکعت نماز ادا کرلوں۔ اسپر امیر صاحب نے کہا کہ یہ اللہ کا گھر ہے ہم سے اجازت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آپ بخوشی نفل ادا کیے۔ میں نے

بشیر ناصر صاحب کو کہا کہ نماز پڑھتے ہوئے فوٹو نہ لیں یہ حکیم صاحب کا اپنے خدا کے ساتھ ذاتی معاملہ ہے، معلوم نہیں ان کو پسند بھی ہو کہ نہ، یا اس میں کوئی ریا کا معاملہ نہ نکلے۔ مگر جب تین کیمرے گردن میں لٹک رہے ہوں تو ایک تو ہاتھ میں خود ہی آ جاتا ہے۔ انہوں نے حکیم صاحب کی نماز پڑھتے بھی فوٹو اتار لی جو ہم نے کسی کو نہ دی مگر میرے پاس محفوظ ہیں۔

جب ہم مسجد سے جانے لگے تو حکیم صاحب نے غسل خانے اور وضو کے کمرے دوبارہ دیکھنے کی خوہش کی اور میری حیرانی کی انتہا یہ ہوئی کہ فوٹو گرافر کو کہا کہ میری اور نصیر کی فوٹو وضو کے کمرہ میں بناؤ۔ مکرم بشیر ناصر صاحب نے تعمیل حکم میں فوٹو تو بنا دی لیکن میرا سوال نہ گیا اور میں نے پوچھا یہاں فوٹو کی حکمت کیا ہے۔ کہنے لگے میں نے سینکڑوں مساجد دیکھیں ہیں مگر اسقدر صاف ستھرا واش روم اور وضو کا نظام نہیں دیکھا۔ چونکہ یہاں عموماً موسم کی شدت کی وجہ سے سب جرابیں پہنتے ہیں اس لیے اکثر ہی مسح کرتے ہیں اس لیے صرف پاؤں دھونے کے لیے میں نے علیحدہ نظام بنا دیا تھا اور باقی ہاتھ منہ دھونے کیلئے عام مروجہ طریقہ کی ایک بہت لمبی سی سنک بنوائی تھی کی پانی زمین پر نہ پڑے۔ سب نمازی کھڑے کھڑے وضو کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں نے پاؤں دھونے ہوں وہ دوسری طرف جا سکتے تھے۔ عام دوسری مساجد میں ابھی بھی سٹول پر بیٹھ کر وضو کیا جاتا ہے۔ اسی طرح میں نے بجلی سے چلنے والی آٹو میٹک ٹوٹیاں بھی لگوائیں تھیں۔ آجکل تو عام ہیں مگر ان دنوں آٹو میٹک ٹوٹیاں نئی نئی آئیں تھیں اور بہت کم لوگوں نے انکو دیکھا تھا۔ ہاتھ آگے کرتے ہی پانی آنا شروع ہو جاتا تھا اور ہاتھ پیچھے کرتے ہی پانی بند ہو جاتا تھا۔ دراصل ان میں بجلی کا ایک سوئچ ہوتا ہے اور ایک لیزر ہاتھ کی حرکت کو محسوس کر کے پانی کو آن اور آف کر دیتا ہے۔

بہت عرصہ پہلے جب میں پاکستان میں تھا تو اسوقت میں نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ یورپ اور امریکہ میں جادو نما ٹوٹیاں بھی ہیں جو ہاتھ آگے کرتے ہی پانی کھول دیتیں ہیں لیکن جب میں کینیڈا آیا اور یورپ اور امریکہ بھی گھوما تو کبھی کسی جگہ بھی ایسی ٹوٹیاں نظر نہ آئیں تھیں۔ جب تعمیر مسجد کے دوران مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایسی ٹوٹیاں اب مارکیٹ میں آ گئیں ہیں تو مجھے مسجد کو ماڈرن بنانے کی خواہش میں ان کو لگوانے کا خیال آیا۔ ایک اور بھی وجہ بن گئی تھی کہ اس زمانہ میں ہمیں چونکہ پانی کی سپلائی کا بہت مسئلہ تھا کیونکہ سٹی کا پانی ان دنوں میں میسر نہ تھا اس لیے پانی کی بچت کرنے کے لیے بھی یہ علاج بھلا لگا۔ تقریباً دس سال تک یہ ٹوٹیاں چلتی رہیں اور پھر بعد میں جب ان میں کچھ خرابیاں پیدا ہوئیں تو انتظامیہ نے ان کو تبدیل کر کے عام ٹوٹیاں لگوا دیں۔ یہ ٹوٹیاں مکرم حکیم صاحب کی خاص توجہ کا مرکز بھی بن گئیں۔ کہنے لگے کہ جو یونیورسٹی مدینتہ الحکمت کے نام سے بنا رہا ہوں اس میں ایک مسجد بھی بنا رہا ہوں اور وہاں اسی قسم کے غسل خانے اور وضو کا نظام بنواوں گا۔ اور یہ تصویر اس لیے بنوائی ہے کہ پاکستان جا کر دکھا سکوں۔ مشرقی عبادت گاہوں سے متعلق عموماً تاثر یہی ہوتا ہے کہ صفائی کا خیال نہیں رکھا جاتا، اس لیے، ان دنوں تقریباً ہر وزٹر یہ سوال عموماً کرتا تھا کہ مسجد کو اسقدر صاف کیسے رکھتے ہیں۔

مسجد کو دیکھنے کے بعد ہم مکرم امیر صاحب کی رہائش گاہ ان کی بیٹھک میں چلے گئے جہاں کچھ تو ضع کا انتظام تھا۔ وہاں اور باتیں شروع ہو گئیں۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے میں نے سنا ہے کہ حضرت مرزا صاحب کی کتب کا نیا سیٹ دوبارہ چھپا ہے۔ جب انہیں کہا کہ یہ درست ہے تو کہنے لگے کہ کچھ پرانی کتب تو میرے پاس ہیں لیکن میری ذاتی لائبریری میں پورا سیٹ نہیں اور اگر ممکن ہے تو ایک پورا سیٹ مجھے دیں۔ پھر

کہا کہ اپنے ساتھ لے کر نہیں جاسکتا کیونکہ سامان میں جگہ نہیں لیکن آپ لوگ مجھے پارسل کر دیں اور ڈاک خرچ میں خود دوں گا۔ بلکہ آپ لوگ پی آئی اے (PIA) والوں کو دے دیں ان کے ساتھ میرا اکاؤنٹ ہے اور وہ ساری دنیا سے میری کتب اور دیگر اشیا لے کر جاتے ہیں اور ہم بل آنے پر ان کو رقم ادا کر دیتے ہیں۔ جب ہم نے کہا کہ ایسا کر دیں گے تو پھر فرمایا۔ ایک شرط ہے۔ کتب کی قیمت ادا کروں گا ورنہ نہیں لوں گا۔

اور باتوں کے علاوہ اپنے خاص تعلقات سر چوہدری ظفر اللہ خاں مرحوم کے ساتھ کا بھی ذکر کیا۔ کہنے لگے میں ان کی اور وہ میری بہت عزت کرتے تھے۔ بلکہ ان کے مرض الموت میں آخری معالج بھی میں ہی تھا۔ اور پھر یہ دلچسپ واقعہ بھی سنایا کہ ایک دن مجھے پیغام ملا کہ سر ظفر اللہ خان نے یاد فرمایا ہے۔ میں جہاز میں کراچی سے لاہور گیا تو ان کی خدمت میں ان کے گھر حاضر ہوا۔ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے، دیکھتے ہی فرمایا حکیم صاحب میرے پاس بیٹھ جائیں اور باتیں کریں۔ میں نے کہا آپ نے یاد فرمایا ہے تو میں حاضر ہوں۔ سر ظفر اللہ خان نے فرمایا میرے عزیز اور اقارب یہ سمجھتے ہیں کہ میں بیمار ہوں اور ڈاکٹروں کو بلاتے رہتے ہیں۔ لیکن حکیم صاحب میں بیمار نہیں ہوں بلکہ اپنی طبعی عمر کو اب پہنچ چکا ہوں۔ اب میں نے ان کی تسلی کی خاطر یہ کہا ہے کہ اگر میں نے علاج کروانا ہے تو حکیم سعید صاحب کو بلائیں۔ آپ میرے پاس بیٹھ کر باتیں کریں تا کہ میرے رشتہ داروں اور عزیزوں کو تسلی ہو۔ حکیم صاحب کہنے لگے میں بات کو سمجھ گیا اور کچھ دیر ان کے پاس رہا۔ اسی طرح ایک اور واقعہ بھی سنایا کہ ایک دفعہ شام ہمدرد کے تحت کراچی میں ایک بین الاقوامی موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا جس میں سر ظفر اللہ خان مرحوم کو تقریر کرنے کیلئے دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ جب سیمینار کا دن آیا تو ہال کے باہر مولویوں نے شور مچا کر لوگ اکٹھے کر لیے۔ مجھے بتایا گیا کہ باہر شور شرابہ ہو رہا ہے۔ میں خود باہر گیا تو مولوی کہنے لگے کہ سر ظفر اللہ خان قادیانی ہے۔ میں نے کہا پھر کیا ہوا۔ کون سا انہوں نے کسی مذہب کی بات کرنی ہے۔ مولوی نہ مانے۔ میں نے ان کو یہ تجویز دی کہ اس موضوع پر سر ظفر اللہ خان سے بہتر آدمی مہیا کر دیں تو ہم ان سے تقریر نہیں کروائیں گے۔ جب پاکستان میں فی الوقت اس موضوع پر ان سے بہتر آدمی موجود نہیں تو واویلا کرنے کا کیا فائدہ۔ اب مولویوں کے پاس اسکا جواب نہ تھا اسطرح ان سب کو وہاں سے رخصت کیا۔ سر ظفر اللہ خان نے بہت عمدہ تقریر کی۔ کہنے لگے میں سب کو کہتا ہوں کہ تم لوگ احمدیوں کو کافر کافر کہتے رہو اور وہ چپ چاپ اپنا کام کرتے رہیں گے۔ اور بہت سی باتیں بھی ہوئیں لیکن اتنے عرصہ بعد یہی یاد رہ گیا ہے۔ ہم نے حکیم صاحب کو کچھ اور کتب اور بیت الاسلام مسجد کی ایک تصویر اور اسکا ایک خوبصورت ماڈل بھی تحفہ میں دیا۔ مکرم کرنل انور احمد صاحب نے حکیم صاحب سے ایک وزیٹر والی کتاب میں دستخط بھی کروے لیکن اب معلوم نہیں وہ رجسٹر کہاں ہے۔

حکیم سعید صاحب کے پاکستان واپس جانے کے بعد بھی میرا ان کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ قائم رہا۔ ایک دفعہ ان کا پیغام بھی آیا کہ جو پروجیکٹر میں نے آپ کی مسجد میں دیکھا تھا اس قسم کا مجھے مل نہیں رہا اس لیے اسکی تفصیل روانہ کروں کہ کس کمپنی کا بنا ہے اور کیا ماڈل ہے۔ میں نے وہ تفصیلات روانہ کر دیں۔ میرے بچے چھوٹے تھے اور مجھے ان کو اردو سکھانے کا شوق پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں مجھے بچوں

کی کہانیوں کی کتب کی تلاش ہوئی۔ میں نے ہمدرد کی شائع کردہ بچوں کی کتب کی ایک فہرست بنا کر اور ساتھ پاکستانی رقم میں ان کی قیمت کے برابر ایک چیک (جو میں نے مکرم کرنل محمد سعید صاحب مرحوم سے ادھار لیا تھا) بھی حکیم صاحب کو روانہ کر دیا۔ دو ماہ بعد ایک پارسل بذریعہ بحری جہاز موصول ہوا جس میں سب کتب بھی تھیں اور ساتھ مکرم حکیم صاحب کا خط بھی تھا۔ اور لفافہ میں چیک واپس کر دیا کہ کتب میری طرف سے بچوں کیلئے تحفہ میں وصول کریں۔ جب میرے بچے چھوٹے تھے اسوقت ہم انکو رات سونے سے پہلے ان کتب سے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ جب بڑے ہو گئے تو ان کا استعمال ختم ہو گیا۔ بہت عرصہ بعد جب جامعہ احمدیہ کینیڈا کا ادارہ قائم ہوا اور اس سلسلہ میں اسکی لائبریری کے لیے کتب کی تحریک ہوئی تو میں نے وہ سب کتب اردو سیکھنانے کی غرض سے ان کو دے دیں۔ اب نامعلوم وہ وہاں ہیں کہ نہیں۔ لیکن دراصل یہ کتب میری طرف سے نہیں بلکہ حکیم محمد سعید صاحب مرحوم کی طرف سے ہی ہیں کیونکہ اصل تحفہ ان ہی کی طرف سے مجھے ملا تھا جو میں نے آگے دے دیا۔

حکیم صاحب نے اسی ملاقات میں یہ بھی بتایا کہ ایک دفعہ جنرل ضیاء الحق جو اس وقت پاکستان کے صدر تھے انہوں نے حکیم صاحب کو گورنر سندھ بنانے کی پیشکش کی تھی مگر حکیم صاحب نے قبول نہ کیا۔ لیکن جب حکیم صاحب کینیڈا کے دوسرے دورہ سے واپس پاکستان گئے تو چند ماہ بعد انکو گورنر سندھ بنا دیا گیا۔ غالباً اسوقت پاکستان میں بینظیر بھٹو کی دوسری حکومت تھی۔ حکیم صاحب جولائی 1993ء سے لے کر مئی 1994ء تک سندھ صوبہ کے گورنر کے عہدہ پر فائز رہے۔ اسکے بعد انہوں نے اس عہدہ سے استعفا دے دیا اور دوبارہ اپنے ہمدرد دواخانہ کے کاموں میں اور مدینتہ الحکمت کی تعمیر میں مشغول ہو گئے۔ اکتوبر 1998ء میں یہ جانکاہ خبر آئی کہ اس نایاب اور ہمدرد انسان کو کسی نے اسوقت گولیاں مار کر شہید کر دیا ہے جب وہ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے مطب میں جا رہے تھے۔ آجتک حکیم صاحب کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ شہادت کے دن بھی وہ روزہ سے تھے اور اس وقت ان کی عمر 78 سال تھی۔ حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کی وجہ سے شہادت کے چار سال بعد 2002ء میں نشان امتیاز کا تمغہ بھی عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر بیشمار رحمت کی بارش کرے۔ ایسے لوگ تو صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے ساتھ ان کا تھوڑا سا گزرا ہوا وقت ایک نادر یادگار ہے۔ پچھلے پچیس برس سے تاریخ کا یہ قرض اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا تھا کہ کسی وقت اس واقعہ کو تحریر میں لا کر مسجد بیت الاسلام کینیڈا کی تاریخ کا حصہ بنا دوں۔ ایک ربع صدی کے بعد اس فرض سے اب سبکدوش ہوتا ہوں۔

ڈاکٹر ساجد علی

کتاب خواں کہاں کھو گیا

بیان کیا جاتا ہے کہ پطرس بخاری نے ایک بار آل انڈیا ریڈیو پر ایک تقریر ریکارڈ کروائی۔ ریکارڈنگ کے بعد پتا چلا کہ ایک لفظ کا تلفظ غلط ادا ہو گیا ہے۔ پطرس نے دوبارہ ریکارڈنگ کرنے کو کہا۔ عملہ متذبذب تھا۔ کسی نے کہا سر جانے دیجیے، ہزار میں کوئی ایک ہو گا جو اس غلطی کو نوٹ کرے گا۔ پطرس نے جواب دیا کہ مجھے اسی ایک خبیث کا ڈر ہے۔

پطرس بخاری کی تلفظ کے بارے میں اتنی حساسیت تھی کہ اگر غلطی کسی ایک فرد نے بھی پکڑ لی تو یہ رسوائی کی بات ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بہت عالم فاضل حضرات بھی حقائق اور معلومات کے متعلق حساس نہیں ہیں۔ جو ان کے قلم سے نکل گیا وہ اسی کو حرف آخر سمجھ لیتے ہیں۔

کتاب چھپنے کے بعد شاید کوئی سخن فہم قاری بھی نصیب نہیں ہوتا جو غلطی پر متنبہ کر سکے تا کہ آئندہ ایڈیشنوں میں اس غلطی کا اعادہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو کتابوں میں نادانستہ طور پر در آنے والی واقعاتی اور معلوماتی غلطیوں کی آئندہ ایڈیشنوں میں اصلاح ہو جاتی۔ اب وہ کتابیں برسوں سے چھپ رہی ہیں؛ کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں لیکن اغلاط جوں کی توں موجود ہیں۔ آئندہ سطور میں چند مثالیں پیش کر رہا ہوں لیکن میرا گلہ مصنف سے زیادہ مدیر اور قاری سے ہے۔

جناب شمس الرحمان فاروقی علم و مطالعہ کا بحر ذخار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زود قلم مصنف بھی تھے۔ جس بھی موضوع پر قلم اٹھاتے معلومات کا دریا بہا دیتے تھے لیکن اس دریا میں کبھی کچھ خزف ریزوں سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ادب سے لطف اندوز ہونے کے لیے کسی مخصوص عقیدے پر کاربند ہونا ضروری نہیں۔ اگر میں صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی رومی کو، کرشن بھگتی

والا ہندو نہ ہوتے ہوئے بھی جے دیو کی طویل نظم "گیت گووند" کو، روسی کیتھولک نہ ہوتے ہوئے بھی دستئفسکی کو پڑھ اور پسند کر سکتا ہوں۔"
اب یہ بات ظاہر ہے کہ روسی کیتھولک نام کا کوئی مذہب یا فرقہ دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ فاروقی صاحب کو اس بات کا علم تھا کہ دستئفسکی رومن کیتھولک مذہب کا پیرو کار نہیں تھا۔ اب اس کے روسی ہونے کے ناتے فرق ظاہر کرنے کی خاطر اسے روسی کیتھولک لکھ دیا حالانکہ روس کے لوگ آرتھوڈوکس چرچ کو ماننے والے ہیں۔
یہ بہت معمولی نوعیت کی غلطی ہے جو بے دھیانی میں کسی سے بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ یہ بات فاروقی صاحب نے جاں نثار اختر پر شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھی تھی جو سن 1976 میں ایک مجلے میں چھپا تھا۔ فاروقی صاحب کی تحریروں کو ہزاروں لوگ پڑھتے ہوں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان کے کسی دوست یا قاری نے انھیں اس سہو پر مطلع نہیں کیا تھا؟ کیونکہ اگر کسی نے ایسا کیا ہو تا تو فاروقی صاحب کے متعلق مجھے یقین ہے وہ بلا تامل درستی کر لیتے۔ اس بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے کہ چونتیس برس بعد یہ مضمون ان کی کتاب "معرفت شعر نو" (2010) میں دوبارہ شائع ہوا تو یہ ادنی سی غلطی بعینہ موجود ہے۔
اسی طرح فاروقی صاحب کی ایک اور کتاب "صورت و معنی سخن" کے اس بیان پر حیرت کا سامنا کرنا پڑا:
"چین کے مشرقی علاقے میں مسلمان حضرت عثمان کے وقت سے ہیں اور اکثریت میں ہیں۔ انھوں نے مقامی چینی زبان اور رسم الخط کو حسب سابق قائم رکھا ہے۔" (ص 217)
چین کے مشرقی علاقے میں مسلمان کبھی اکثریت میں نہیں رہے۔ چین میں وہ علاقہ، جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، سنکیانگ کہلاتا ہے جو چین کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کا ایک پرانا نام مشرقی ترکستان تھا۔ میرا خیال ہے کہ فاروقی صاحب کے نہاں خانہ دماغ میں یہ نام موجود تھا اور مشرقی لفظ کے تلازمے سے دھوکا کھا کر سنکیانگ کو مشرقی چین میں پہنچا دیا۔
اسی کتاب میں ایک اور بیان ملاحظہ کیجیے:
"مصر کے مغرب میں جو ممالک شمالی افریقہ کے ہیں ان میں سوڈان، لیبیا، مراکش (کذا) اور الجیریا نمایاں ہیں۔" (ص 237)۔ فاروقی صاحب غالباً ٹیونس لکھنا چاہتے تھے لیکن سہواً سوڈان لکھ گئے جو مصر کے مغرب میں نہیں بلکہ جنوب میں ہے۔
یہ کتاب آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہے۔ (2011) کیا اس پریس والوں نے بھی ایڈیٹر کی جاب ختم کر دی ہے؟
اب میں دل پر پتھر رکھ کر فاروقی صاحب کے ایک ایسے سہو قلم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی میں کوئی توجیہہ کرنے سے قاصر ہوں۔ ان کا ایک انگریزی مضمون ہے جو کئی جگہ شائع ہو چکا ہے:
The Image of Satan in Iqbal and Milton
اس میں ان کا فرمانا ہے کہ سوائے ابلیس کے تمام فرشتوں نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اصل انگریزی جملہ یہ ہے۔
" [T]he Quran, from which all truly Islamic traditions derive their sanction, does not raise this issue but stated plainly that all angels 'except Iblis' refused to pay obeisance to Adam"

“Iqbal: Essays and Studies” , edited by Asloob Ahmad Ansari. Iqbal Academy Pakistan. 2004. P.259

عقل حیرت زدہ ہے کہ کسی بھی مدیر کی نظر اس جملے پر کیوں نہیں پڑی تھی۔

محمد حسن عسکری مرحوم کے عمیق علم اور وسیع معلومات پر دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ عسکری صاحب اپنے علم سے قاری کو مرعوب ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس پر دہشت بھی طاری کر دیتے تھے۔ تازہ بتازہ معلومات کے اظہار کا اسلوب کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ ”پروفیسر (پطرس) بخاری مرحوم کی نظر سے مشہور افسانہ نگار محمد حسن عسکری کے بعض ’تنقیدی‘ مضامین گزرے۔ بے ساختہ پکار اٹھے:“ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے عسکری صاحب ان فرانسیسی ادیبوں کے ساتھ رات بھر تاش کھیلتے رہے ہوں۔“(مقالات ن م راشد۔ مرتبہ شیما مجید۔ ص296)

عسکری صاحب کا مجموعہ مضامین ”وقت کی راگنی“ ان کی وفات کے بعد احمد مشتاق اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے سن 1979 میں شائع کیا تھا۔ اس کے پیش لفظ میں انھوں نے بیان کیا کہ یہ مضامین عسکری صاحب نے اپنی زندگی میں انھیں اشاعت کے لیے دیے تھے۔ انھوں نے یہ وضاحت بھی کی تھی کہ ”عسکری صاحب نے اس کتاب کا مسودہ اشاعت کے لیے دیتے ہوئے مضامین میں بعض تبدیلیاں بھی کی تھیں۔ بعض فقرے کاٹ دیے تھے اور بعض جگہ لفظ تبدیل کیے تھے۔“

اس اہتمام کے باوجود مجھے ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا جب ان کے مضمون ”جدید عورت کی پرنانی“ کے اختتام پر اس سطر پر نظر پڑی: ”لیڈی میکبتھ کا کیا انجام ہوا یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو بالکل ہی تازہ خبر ہے کہ بریژیت باردو نے خودکشی کر لی“ ۔ یہ مضمون 1960 میں تحریر کیا گیا تھا۔ مضمون تحریر کرنے اور رسالے میں اس کی اشاعت کے دوران میں کم از کم چند ہفتوں کا وقفہ تو ضرور حائل رہا ہو گا۔ اس عرصے میں عسکری صاحب تک یقیناً یہ خبر پہنچ گئی ہو گی کہ خودکشی کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور باردو کی زندگی بچا لی گئی ہے۔ اس پر صرف یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ تا حال زندہ ہے۔ کمال یہ ہے کہ نہ عسکری صاحب نے جملہ حذف کرنے کے لیے کہا نہ رسالے کے مدیر کو اس پر کوئی اعتراض ہوا۔ اس مضمون کی تحریر و اشاعت کے بعد عسکری صاحب اٹھارہ برس تک حیات رہے لیکن انھوں نے اس جملہ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید انھیں یقین تھا کہ اگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تو وہ دوبارہ ایسی کوشش ضرور کرے گی کیونکہ اس کا یہی انجام مقدر ہے۔

مسعود مفتی اردو زبان کے نامور ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کا ایک بہت مشہور اور اثر انگیز افسانہ ’یا خدا‘ ہے جو اولاً سن 1960 میں مجلہ ”سویرا“ کے شمارہ نمبر 31 میں شائع ہوا تھا۔ افسانے میں سپین کے ایک غار کو تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا یہ جملہ بہت تعجب انگیز ہے:”اس کے سامنے سپین کی سرزمین پھیلی ہوئی تھی۔ اپریل 1960ء کے سورج کا سنہری طشت بحر الکاہل کے نیلے پانی میں غوطہ لگانے کو تھا“ ۔

مسئلہ یہ ہے کہ سپین کے جس سمندر میں سورج غروب ہو گا اسے اٹلانٹک کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا نام بحر اوقیانوس ہے۔ بحر الکاہل تو سپین کے مغربی ساحل سے پانچ ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع ہے اور دونوں کے درمیان امریکہ کا بر اعظم حائل ہے۔

کوئی چار برس بعد مسعود مفتی کے افسانوں کا مجموعہ "محدب شیشہ" شائع ہوا۔ میرے پیش نظر کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جو سن 1979 میں طبع ہوا۔ اس میں مذکورہ بالا جملہ کسی ترمیم و تصحیح کے بغیر موجود ہے۔ گویا نہ "سویرا" کے مدیر نے اس تسامح کو نوٹ کیا اور نہ کسی قاری نے مفتی صاحب کو اس پر متنبہ کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں جس شخص نے مسلمانان ہند کے ذہنوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مولانا ابو الکلام آزاد ہیں۔ ان کے "الہلال" نے دلوں میں آگ لگا دی تھی۔ ان کی نثر میں خطیبانہ سحر بیانی تھی جو دل و دماغ کو جکڑ لیتی تھی۔ ان کی نثر کو حسرت موہانی نے اس طرح داد دی تھی:

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

لیکن اس جوش میں قلم کبھی کبھار ٹھوکر بھی کھا جاتا تھا۔ چنانچہ ملک زادہ منظور احمد نے اپنی کتاب "مولانا ابو الکلام آزاد الہلال کے آئینہ میں" میں بیان کیا ہے کہ "الہلال میں کہیں کہیں تاریخی، علمی اور واقعاتی غلطیاں ہیں" (ص160)اور کچھ غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔

مولانا کی مشہور کتاب "تذکرہ" ان کے اسلوب خاص کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔ مکتبہ میری لائبریری والوں نے سن 1960 میں اس کتاب کا پیپر بیک ایڈیشن شائع کیا تھا۔ یہ کتاب میرے گھر میں موجود ہوتی تھی۔ سکول کے زمانہ میں کئی بار کی کوشش کے باوجود میں اسے مکمل نہ پڑھ سکا لیکن اس کے آخر پر جو طویل ذاتی قصیدۂ مدحیہ تحریر کیا گیا ہے وہ ضرور پڑھا تھا اور اس وقت پسند بھی آیا تھا۔ گزشتہ دنوں کسی ضرورت کے تحت اس کتاب کو دیکھنا پڑا تو اس فقرے کو پڑھ کر دنگ رہ گیا:

"سورج نے کہا: دو لاکھ میل دور ہوں، قطب شمالی سے روشنی اتری اور بولی، ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ نوے ہزار میل طے کرتی ہوں۔ مگر آنکھوں نے کہا یہ تو تار نگاہ کی پہلی منزل ہے۔" ۔(تذکرہ۔ میری لائبریری ایڈیشن۔ ص294)

قطب شمالی سے روشنی کے اترنے کا مطلب تو میں آج بھی نہیں سمجھ پایا لیکن سورج کا زمین سے فاصلہ نو کروڑ میل سے کچھ زیادہ ہے۔ اسے کسی صورت سہو کتابت بھی نہیں کہا جا سکتا۔

روایت کیا جاتا ہے کہ پہلا ایڈیشن مولانا کی رضا اور منشا کے بغیر شائع ہوا تھا۔ وہ اس پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے لیکن اس کا موقع نہ مل سکا۔ بعد ازاں ممتاز محقق مالک رام صاحب نے "تذکرہ" کا تحقیقی ایڈیشن شائع کیا جو تین مرتبہ طبع ہو چکا ہے۔ مالک رام صاحب کا کہنا ہے کہ ان کے پیش نظر مصنف کا ذاتی نسخہ تھا جس میں بہت سے مقامات پر اصلاحیں کی گئی تھیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ اس ایڈیشن میں بھی یہ عبارت بعینہ موجود ہے (ص325)اور مالک رام صاحب نے اس پر کوئی نوٹ لکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

مولانا غلام رسول مہر مرحوم مولانا آزاد کے بہت ارادت مند تھے اور ان کی بیعت بھی کی ہوئی تھی۔ لیکن مہر صاحب مولانا آزاد صاحب کی سیاست سے اختلاف رکھتے تھے اور "انقلاب" اخبار میں اس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے نام مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ بھی شائع کیا۔ اس میں 25 جنوری 1937 کا ایک خط ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مہاتما گاندھی نے ہندی ہندوستانی کا مسئلہ اٹھایا ہوا تھا اور

پورے ملک میں دیوناگری رسم الخط کو رائج کرنے کی مہم برپا کر رکھی تھی۔ اسی زمانے میں صوبہ سرحد میں جو حکومت بنی اس نے وہاں ہندی گرمکھی سکولوں کی گرانٹ بند کر دی تھی۔ اس مسئلہ پر مولانا آزاد مہر صاحب کو خط میں لکھتے ہیں:

"اس عقل فروش نے وحدت زبان و رسم الخط کا راگ گا کر مٹھی بھر سکھوں کے گرل اسکولوں کی سرکاری اعانت بند کر دینی چاہی ہے، مگر اتنی واضح بات سامنے نہ آئی کہ اگر ٹھیک انھی دلائل کی بنیاد پر کل کو بہار، یوپی، مدراس، آسام اور بمبئی میں ہندو اکثریت نے ناگری رسم الخط کو سرکاری قرار دے دیا اور اردو رسم الخط والے سکولوں کو سرکاری اعانت سے محروم کر دیا تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟" (نقش آزاد۔ ص 122-23)

اس خط میں مولانا کے دلائل سے مجھے مکمل اتفاق ہے لیکن ناگری رسم الخط جاری کرنے کے خواہاں ہندو اکثریتی صوبوں میں مدراس کا نام پڑھ کر حیرت ہوئی ہے۔ جنوبی ہندوستان میں جو زبانیں رائج ہیں (تامل، تیلگو، ملیالم، تولو اور کنڑ) ان کا رسم الخط ناگری نہیں ہے اور وہ گاندھی جی کی ناگری لپی کو رائج کرنے کی کوششوں کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔ ان زبانوں نے آج تک ناگری رسم الخط کو نہیں اپنایا نہ کبھی ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے محض زور کلام میں مدراس کو بھی شامل کر لیا کیونکہ یہ تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ رسم الخط کے مناقشے کے تمام پہلوؤں سے واقف نہ ہوں گے۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا مہر صاحب نے بھی اس پر کوئی وضاحتی نوٹ لکھنا پسند نہیں کیا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو میں بالعموم تحریر لکھ کر اشاعت سے پہلے کسی کو پڑھانے کا رواج نہیں ہے۔ صاحبان قلم شاید ایسے افراد کو دوست بنانا پسند نہیں کرتے جو ان کے لکھے پر آزادانہ رائے دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ مدیران کرام نام پڑھ کر سوچ لیتے ہیں کہ جو لکھا ہے وہ درست ہی لکھا ہو گا۔ اور جہاں تک قارئین کا تعلق ہے تو گمان ہوتا ہے کہ وہ ہر حرف نوشتہ و مطبوعہ کو مذہبی متون کے مانند جوش عقیدت میں آنکھیں بند کر کے ہی پڑھتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک بات کہی جاتی ہے کہ مغرب میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے جی چاہتا ہے کہ دو چار مثالیں وہاں سے بھی پیش کر دی جائیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مغربی دنیا میں بھی اشاعت وطباعت کا معیار روبہ زوال ہے۔ اتنی بے کار تحریریں شائع ہوتی ہیں کہ کال پوپر اسے اشاعتی دھماکہ کہا کرتا تھا۔ سن 2019 میں ہالینڈ کے مشہور اشاعتی ادارے سپر نگر نے میرے پسندیدہ فلسفی ماریو بنگے کی صد سالہ سالگرہ پر

Mario Bunge: A Centenary Festschrift

شائع کی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں مرتب نے لکھا ہے کہ کاپی ایڈیٹنگ تمام اشاعتی اداروں کے لیے معمول کی کارروائی ہوتی تھی لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اس لیے بلاشبہ کتاب میں ٹائپنگ کی غلطیاں، نامکمل حوالہ جات، خراب اوقاف و رموز اور غیر واضح جملے دکھائی دیں گے۔

امریکہ کا ایک بہت مشہور اشاعتی ادارہ ہے:Scarecrow Press اس ادارے کا خاص امتیاز علمی اور حوالہ جاتی کتابوں کی اشاعت ہے۔ ان کی ایک بہت مشہور سیریز ہے ہسٹاریکل ڈکشنری۔ تقریباً ہر ملک کے نمایاں تاریخی واقعات کو بیان کرتی یہ ڈکشنری موجود ہے۔ "ہسٹاریکل ڈکشنری آف پاکستان" کے مصنف شاہد جاوید برکی ہیں۔ برکی صاحب ورلڈ بینک میں بہت اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔

اس ڈکشنری کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور میرے سامنے یہی تیسرا ایڈیشن ہے۔

افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس کتاب حوالہ میں متعدد غلطیاں موجود ہیں۔ مثلاً مغل بادشاہ ہمایوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ قنوج کی جنگ میں شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد افغانستان چلا گیا تھا۔ پاکستان کے شاید ہر میٹرک پاس بچے کو بھی یہ معلوم ہو گا کہ ہمایوں افغانستان نہیں بلکہ ایران گیا تھا۔ ہمایوں شکست کے بعد لاہور ضرور آیا تھا لیکن یہاں اس کا بھائی مرزا کامران حکمران تھا۔ ہمایوں نے کابل جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہمایوں سندھ اور راجستھان کے علاقے میں کئی برس تک بھٹکنے کے بعد ایران چلا گیا تھا۔ اس کے بیٹے اکبر کی پیدائش بھی سندھ کے علاقے میں ہوئی تھی۔

معلوم نہیں کہ یہ کتاب پروفیسر کے کے عزیز صاحب کی نظر سے گزری تھی یا نہیں کیونکہ اس میں مثلاً 23 مارچ اور 14 اگست کی تاریخوں والی اغلاط موجود ہیں جن کا رونا انھوں نے اپنی کتاب "مرڈر آف ہسٹری" میں رویا ہے۔ سن 1956 کے آئین کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کا نفاذ دو مارچ کو ہوا حالانکہ دو مارچ کو سکندر مرزا نے آئین کی منظوری دی تھی اور اس کا باقاعدہ نفاذ 23 مارچ کو ہوا تھا۔ اس کے علاوہ چودھری محمد علی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی وفات لاہور میں ہوئی حالانکہ وہ کراچی میں فوت ہوئے تھے اور وہیں مدفون ہیں۔ پتا نہیں کہ اتنے بڑے اشاعتی ادارے نے اس کتاب کو چھاپنے سے پہلے اس کی ریفرنگ کروائی تھی یا نہیں۔

مسلم فلسفے پر لکھنے والوں میں ماجد فخری کا نام بہت نمایاں ہے۔ موصوف لبنانی نژاد تھے اور امریکن یونیورسٹی آف بیروت میں فلسفہ کے پروفیسر رہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی پڑھاتے رہے۔ مسلم فلسفہ کی تاریخ پر ان کی کتاب بہت مقبول ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب برسوں سے پنجاب یونیورسٹی کے مسلم فلسفہ کے پرچے کے نصاب میں شامل ہے۔ ابن رشد پر اس کی کتاب دیکھتے ہوئے مجھے اس جملے پر چونکنا پڑا:

"Ahmed Ibn Hanbal. This famous tradition-monger, whose Musnad is one of the six canonical collections of Hadith..."(AVERROES: HIS LIFE, WORKS AND INFLUENCE. 2001)

ایک بہت نامور محدث کو tradition-monger کہنا مناسب دکھائی نہیں دیتا لیکن اس جملے میں واقعاتی غلطی یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل کی مسند کو کبھی بھی صحاح ستہ میں شمار نہیں کیا گیا۔

علامہ اقبال نے طالب علم کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

علامہ اقبال کی اس نصیحت کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ہر کوئی صاحب کتاب بن گیا ہے اور اس ہجوم میں کتاب خواں کہیں گم ہو گیا ہے۔

(ہم سب۔ 28/03/2021)

تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن یو ایس اے اسکالرشپ (رپورٹ نظارت تعلیم)

تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن یو ایس اے اسکالرشپ

تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن USA کی طرف سے پاکستان کے احمدی اور ذہین طلباء وطالبات کیلئے نظارت تعلیم صدر انجمن احمدیہ ربوہ کے تحت انعامی اسکالرشپس اور قرض فنڈز جاری ہیں جن سے متعدد طلباء وطالبات استفادہ کر رہے ہیں۔ بہت سے طلبہ ان وظائف کی مدد سے اپنی تعلیم مکمل کر کے پیشہ ورانہ زندگی شروع کر چکے ہیں اور متعدد تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ ایک مستقل سلسلہ ہے جس سے ضرورت مند طلبائے علم کی امداد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

سنہ 2013ء میں حضورانور نے ازراہ شفقت "تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن یو ایس اے اسکالرشپ" جاری کرنے کی منظوری مرحمت فرمائی۔ یہ اسکالرشپ امریکہ میں رہنے والے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے سابق طلبہ کی طرف سے جاری کیا گیا ہے۔ اس اسکالرشپ کے تحت ان کی طرف سے ہر سال 15,000 امریکی ڈالرز دیے جاتے ہیں جو کہ نظارت تعلیم کے تحت ایک منظم صورت میں طلبہ تک پہنچائے جاتے ہیں۔

لیپ ٹاپ قرض فنڈ

"تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن یو ایس اے اسکالرشپ" کا آغاز 2013 میں ہوا۔ ابتدائی سال میں اس اسکالرشپ کی رقم کو حضورانور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی منظوری سے ایک مستقل فنڈ کی صورت دے کر اساتذہ کی تحقیقی ضروریات کے لیے مختص کر دیا گیا۔ اس کے تحت اساتذہ کو دو ہزار روپے ماہانہ کی قسط پہ لیپ ٹاپس مہیا کئے جاتے ہیں اور اب تک 42 اساتذہ کو لیپ ٹاپ مہیا کئے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

2014 سے اس اسکالرشپ کو بنیادی طور پہ دو بڑے حصوں یعنی "قرض فنڈ" اور "انعامی اسکالرشپ" میں تقسیم کر کے رقم طلباء وطالبات میں تقسیم کی جا رہی ہے۔

تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن یو ایس اے تعلیمی قرض فنڈ

اس فنڈ کے لیے -/7,500 امریکی ڈالرز کی رقم مختص کی گئی ہے۔

اس فنڈ سے استفادہ کر کے اب تک 31 طلبہ درج ذیل مضامین میں اپنی تعلیم (ہائیر ایجوکیشن) مکمل کر چکے ہیں۔

M.Phil (Pharmacology)	CA
M.Phil (Physics)	LLB
M.Phil (Human Nutrition)	MBBS
M.Phil (Food Technology)	MS (Orthopedic)
BS (Aviation Management)	BSc (Accounting)
BS (Hons) Computer Science	Pham D (D. Pharmacy)
BS (Hons) Electrical Engineering	BS (Chemistry)

اس وقت 9 طلبہ اس فنڈ کی مدد سے تعلیم جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ہر طالب علم کو ڈگری کی تکمیل تک یہ قرض فنڈ سالانہ رزلٹ کی بنا پر قسط وار دیا جاتا ہے۔

تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن یو ایس اے انعامی اسکالرشپس

اس اسکالرشپ کے تحت اعلیٰ تعلیم کے حصول میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے طلبہ کی حوصلہ افزائی اور مزید تعلیم کے حصول کی خواہش کو مہمیز دینے کے لیے انعامات دیے جارہے ہیں۔ان انعامات کو مختلف ڈگریز میں تقسیم کیا گیا ہے۔

نظارت تعلیم کے تحت کالجز میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے سالانہ مبلغ -/50,000 روپے کی رقم مختص ہے۔اب تک 22 طلبہ میں یہ انعامات تقسیم کئے جا چکے ہیں۔

ایسے طلبہ جو پاکستان کی کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے سائنسز سے متعلقہ مضامین میں بی ایس (آنرز) کی تعلیم مکمل کرتے ہیں ان کے لیے سالانہ مبلغ -/150,000 روپے کی رقم مختص ہے۔یہ اسکالرشپ اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کرنے پر دیا جاتا ہے۔موصولہ درخواستوں میں سے نمبروں کے حساب سے پوزیشن نکالی جاتی ہے۔اس اسکالرشپ کے تحت 25 طلبہ انعامات حاصل کر چکے ہیں۔

اسی اسکالرشپ میں سے ایک انعام ایسے طلبہ کے لیے مقرر ہے جو پاکستان کی کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے کسی بھی مضمون میں ایم فل / ایم ایس کی تعلیم مکمل کرتے ہیں۔ان کے لیے مختص انعامی رقم -/150,000 روپے ہے۔موصولہ

درخواستوں میں اول اور دوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو یہ انعام دیا جاتا ہے۔اب تک 17 طلبہ یہ انعام حاصل کر چکے ہیں۔

اسی اسکالرشپ کے تحت پاکستان کی کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے MBBS اور بیچلرز آف انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ کو بھی انعامات دیے جاتے ہیں۔ایک انعام " ایم بی بی ایس" اور ایک انعام انجینئرنگ کیلئے مختص ہے۔اس اسکالرشپ سے 22 طلبہ فیضیاب ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

یہ اسکالرشپ طلبہ کے لیے دوہرے فائدہ کا موجب ہے۔انٹرمیڈیٹ تا ایم فل میں اعلی کارکردگی دکھانے والوں کو انعامات سے نوازا جاتا ہے جبکہ یہی طالب علم آگے جاکر اعلی تعلیم کے لیے مختلف یونیورسٹیز میں داخلہ حاصل کرتے ہیں تو اسی اسکالرشپ کے پہلے حصہ "قرض فنڈ" سے استفادہ کرتے ہیں۔یوں ان کی تعلیمی ترقی میں معاشی رکاوٹ روک نہیں بنتی۔

اسکالرشپ برائے اساتذہ

"تعلیم الاسلام کالج المنائی ایسوسی ایشن یو ایس اے" انعامی اسکالرشپ صرف طلبا و طالبات تک ہی محدود نہیں بلکہ نظارت تعلیم کے ادارہ جات کے اساتذہ بھی اس اسکالرشپ سے استفادہ کر رہے ہیں۔تدریسی فرائض کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھنے والے اساتذہ کی حوصلہ افزائی کے لیے اس اسکالرشپ میں سے ایک حصہ مختص کیا گیا ہے۔

سالانہ مبلغ ایک لاکھ روپے کی رقم نظارت تعلیم کے ادارہ جات کے ایسے اساتذہ کے لیے مخصوص ہے جو اپنی ملازمت کے دوران کسی بھی منظور شدہ ادارہ سے ایم فل / ایم ایس کی تعلیم مکمل کرتے ہیں۔نظارت کے متعدد اساتذہ اس وقت ایم فل کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جبکہ 32 اساتذہ ایم فل مکمل کر کے اس اسکالرشپ سے مستفید ہو چکے ہیں۔

نظارت تعلیم کے ادارہ جات کے ان اساتذہ کے لیے بھی سالانہ -/150,000 روپے کی رقم مختص کی گئی ہے جو اپنی ملازمت کے دوران کسی بھی منظور شدہ ادارہ سے PHD کی تعلیم مکمل کریں گے۔چھ اساتذہ اس وقت پی ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔انعامی رقم ڈگری مکمل کرنے کے بعد تقسیم کی جاتی ہے۔

گزشتہ دس سال کے عرصہ میں جماعت احمدیہ یو۔ایس۔اے کے جن ممبران نے اس اسکالرشپ فنڈ میں عطیات دیے اُن کے نام ذیل میں دعائے خاص کے لیے شائع کیے جارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر عظیم عطا کرے۔ آمین۔

Jama't Code	Donor's Name
BAL	Abbas, Ammar Bin
MAR	Abbasi, Intisar Ahmad
CHC	Abdullah, Fizan Ahmad
SVA	Ahmad, Bilal
MAR	Ahmad, Chaudhry Zubair
MIL	Ahmad, Dr. Laiq
MAR	Ahmad, Farooq
SVA	Ahmad, Gulzar
LIS	Ahmad, Laeeq
GEO	Ahmad, Mahmood
CEJ	Ahmad, Mir Sharif
TUL	Ahmad, Mirza Maghfoor
DAL	Ahmad, Munawar
AUS	Ahmad, Nasim
SAJ	Ahmad, Naveed
BAL	Ahmad, Sardar Anees
ROC	Ahmad, Sardar Rafiq
MAR	Ahmad, Syed Mohammad
PHX	Ahmad, Syed Sajid
WIL	Ahmad, Zaheer Uddin
MAR	Ahmad, Zarif
BAL	Ahmed, Amir Waqar
PHI	Ahmed, Anis
QNS	Ahmed, Aria
MAR	Ahmed, Mobashir
HUN	Ali, Mirza Irshad
BAL	Ali, Zeeshan
LIS	Alladin, Irfan Ahmed
BAL	Ammar, Ghina
BAL	Ammar, Hussain Bin
BAL	Anjum, Ehsan Ellahi
NOJ	Aqeel, Anis Ahmad
COL	Arshad, Affan
COL	Ashraf, Mohammad
HUN	Athar, Bushra
BAL	Baig, Mirza Amin
WIL	Bajwa, Khalid Maqsood

Jama't Code	Donor's Name
QNS	Bajwa, Zinda Mahmood
MAR	Bhatti, Mahmood Ahmad
PHI	Bhatti, Najam u Saher
MIA	Butt, Mohammad Hanif
NVA	Butt, Naima
CEJ	Chaudhary, Imtiaz Ahmad
PHI	Chaudhary, Mujeeb Ullah
NOJ	Chaudhary, Sami Ullah
WIL	Chaudhri, Safee Ullah
BAL	Chaudhry, Halim Muhammad
LAX	Chaudhry, Mahmood Ahmad
MIA	Chaudhry, Munawar Ahmad
BOS	Chaudhry, Muzaffar Ahmed
MAR	Chaudhry, Perwaiz Aslam
SAJ	Chaudhry, Ramla
MAR	Choudhry, Shoukat Pervez
HUN	Choudry, Munawer Ahmad
MAR	Elias, Abdus-Salam Abayomi
BAL	Faheem, Aasilah
LAX	Farooq, Omar M
BAL	Fouzi, Abdul Rashid
NVA	Ghumman, Javaria
DAL	Habib, Zuba
RES	Hameed, Abdul Salaam
TUC	Hameed, Sumreena
MAR	Haque, Reyaz Ul
HQR	Headqtrs, USA
MAR	Idrees, Muhammad
DET	Ijaz, Mujeeb Ismael
BUF	Iqbal, Muhammad Zafar
NVA	Jabbar, Mirza Abdul
HUN	Jamil, Abdul Salam
BAL	Jamil, Nasir Ahmad
LAX	Jattala, Ramzan Ul Haq
BAL	Kahloon, Najma Bushra
CEJ	Khalid, Hamid
STP	Khaliq, Muhammad Abdul
HUN	Khan, Abdul Mannan

Jama't Code	Donor's Name
BAL	Khan, Agha Shahid
BAL	Khan, Ajaz Ahmed
MIL	Khan, Ghulam Murtaza
SAJ	Khan, Mahmood Ahmad
PHI	Khan, Muhammad Sharif
SVA	Khan, Muhammad Zafrullah
MAR	Khan, Mujeebullah
SVA	Khawaja, Rashid Ahmad
STP	Latif, Nasir Kamran
DET	Lughmani, Naeem Ahmad
POR	Luqman, Mirza Muhammed
PHI	Malik, Khalil Mahmood
MAR	Malik, Mansoor Ahmed
NVA	Malik, Mujeeb Rehman
MAR	Malik, Muzaffar Ahmad
YRK	Malik, Shahid Hussain
NOJ	Malik, Shamim
NVA	Mangla, Inayat Ullah
ORL	Mansoor Ahmad Khan
WIL	Masood, Hamid
MAR	Meelu, Ashraf M
CEJ	Mirza, Anas Ahmad
BAL	Mirza, Habeeb Urrahman
RVA	Mobashar, Naseer Ahmad
BAL	Mohammad, Fatehuddin
BRK	Mubasher Alam
LAX	Munawar, Naeem
HUN	Munir, Mohammad Dawood
BAL	Munir, Mohammad Idrees
LAX	Naing, Min Thu
BAL	Nasir, Abdul Qayyum
CEJ	Nazir, Munir Ahmad
NOJ	Qadir, Nusrat Jahan
COL	Qamar, Mehdi Ali
BAL	Qureshi, Faheem Younus
AUS	Qureshi, Lubna Amtul Noor

Jama't Code	Donor's Name
DET	Qureshi, Mahmood Ahmed
MAR	Qureshi, Mohammad Amjad
HUN	Rahman, Shafiq Ur
NVA	Raja, Bilal Ahmad
MAR	Raja, Nasir Ahmad
GEO	Rajayki, Imtiyaz Ahmed
HQR	Rammah, Safir
HUN	Rana, Bilal Ahmed
ALB	Rehman, Hafeez Ur
GEO	Rehman, Nafis
DAY	Rehman, Usama Ibrahim
STL	Saadiq, Rafeeq Luqman
NVA	Sahibzada, Fahim Ahmad
WIL	Saqib, Munawar Ahmad
MAR	Sardar, Hifazat Ahmad
LAX	Sayed, Waseem A
MAR	Shah, Mubarik Ahmad Md
BAP	Shah, Mubasher
NVA	Shahabuddin Saad, Syed Shams
MAR	Shams, Bashir Uddin
MAR	Shams, Bashir Uddin
CHC	Sial, Nausher Ahmad
QNS	Siddiqi, Naeem Akhtar
HUN	Solangi, Mobashir
STP	St Paul, MN
LAX	Surahman, Memet Mahmud
WIL	Syed, Waseem Ahmad
PHI	Tanvir, Mubarak Ahmed
WIL	Tasneem, Tahir Ahmed
BAL	Toor, Masood Ahmad
BOS	Trawalley, Mustapha
NVA	Zafrullah, Haizam
NVA	Zafrullah, Mustafa Ahmad
NVA	Zafrullah, Rubyna
NVA	Zafrullah, Zahid
ALA	Zahid, Mubashir Ahmad
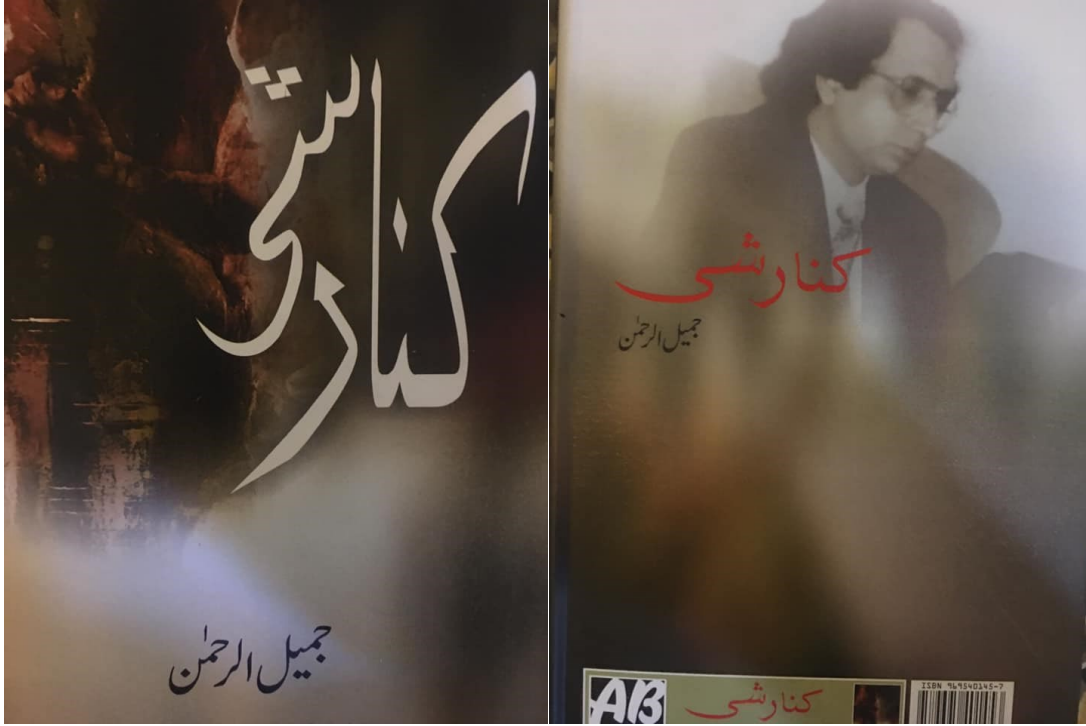
تعارف کتاب ''کنارشی''

جمیل الرحمٰن کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں آپ جدید اردو شاعری کی ساٹھ کی دہائی سے وابستہ ہیں اور اب اس مقام پر ہیں کہ آپ کا نام ہی آپ کے معیار اور انفرادیت کی پہچان ہے۔

بقول جمیل الرحمٰن، ''ادب میں چھوٹی بڑی لکیر نہیں لگائی جاتی۔ ادب انسانی مسئلہ ہے جسے اصناف یا ہیئتوں کے حوالے سے نہیں دیکھا جاتا۔ جمالیاتی اظہار کے امکانات اور باطنی و خارجی پیچیدگیوں کی گرہیں دریافت کرنے کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ ادب میں کوئی ہئیت یا صنف فضُول یا بے کار نہیں ہوتی۔ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ کونسی صنف یا اس کی ہئیت، یا اصناف اور ان کی ہیئتیں غیر متغیر نفسیاتی مسائل اور عصری صورتِ حال کے تناظر میں ممکنہ جمالیاتی حد تک فنی اظہار پر قادر ہیں اور ان میں کتنی گیرائی و گہرائی سمونے کی اہلیت ہے''۔

جمیل الرحمن ایسے سینئر شاعر اور نقاد ہیں کہ ان سے بہُت کُچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

''کنارشی'' ان کی گیارھویں ادبی تخلیق ہے جو انتہائی خُوب صُورت نظموں پر مشتمل ہے۔

۳۲۰ صفحات پر مشتمل یہ خُوب صُورت مجمُوعہ اکادمی بازیافت نے شائع کیا ہے۔ اگلے چند صفحات میں ''کنارشی'' پر جناب غلام حسین ساجد کے ایک سیر حاصل مضمون کے علاوہ ''کنارشی'' سے چند منتخب نظمیں قارئین کے ذوق کی نذر ہیں۔

غلام حسین ساجد

کنارشی۔ سر دُسر مئی فضامیں

پچاس برس کے شعری سفر میں پہلی محبت شاعری کا مطالعہ کرنا رہی ہے کہ یہ میرے وجود کے خلا کو بھرتی اور ذہنی آسودگی کا سبب بنتی ہے۔اس مسافت میں اُسلوب، آہنگ، تخلیقی وفور اور رفعت خیال کے ایسے ایسے رنگ دریافت ہوئے کہ شاعری ایک تخلیقی معجزہ کا بدل محسوس ہوئی اور اس سے لطف اندوز ہونے اور اس کی کنہ تک پہنچنے کے لئے اپنے آپ کو ہر لحہ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نظیر اکبر آبادی سے جمیل الرحمٰن تک تخلیقی تجربے کی ندرت اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے الگ نگاہ رکھنے کی متمنی ہے اور ہم اُسلوب، خیال اور اظہار کی بو قلمونی کو مروّج طریق تفہیم کے سہارے نہیں سمجھ سکتے۔

برسوں پہلے سے میں یہ جانتا ہوں کہ ہر کتاب ایک مکمل وجود ہوا کرتی ہے اور شعری کلیات مکمل آدمی۔ جمیل الرحمٰن اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ ان کا پرسونا(Persona) مکمل ہو چکا ہے۔وہ گیارہ شعری مجموعوں کے خالق ہیں اور ان میں سے "خواب ہوا یا خوشبو" ، "کاریتوال" ، "کوئے بازگشت، ، "میورل" ، "خلازاد" ، "گم شدہ آسمان اوراب" ، "کنارشی" میری نظر سے گزر چکے ہیں اور میں نے بجاطور پر محسوس کیا ہے کہ اس تواتر سے شاعری تخلیق کرنے کے باوجود وہ ثقہ نقادوں کی نگاہ میں ہیں نہ ادبی محفلوں میں زیر بحث رہتے ہیں۔ان کی طرف سے اس صرفِ نظر کا سبب سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ ایک قاری کی حیثیت سے ہم نے اپنی ویسی تربیت نہیں کی، جیسی تربیت بدلتے ہوئے شعری اسالیب، آہنگ اور ان کے باطنی رموز کو سمجھنے کے لئے کرنا لازم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ابھی اُردو آزاد نظم کے بنیاد گزار شعرا کو پڑھنے کی اہلیت ہی پیدا نہیں کر پائے۔ میر اجی، راشد اور مجید امجد ابھی ہمارے لئے کم و بیش اجنبی ہیں۔ایسے میں ہم لسانی تشکیلات کے داعی شعرا اور ان میں سے بھی وجودیت کی تحریک سے وابستہ صفدر میر، افتخار جالب، انیس ناگی، محمد سلیم الرحمٰن،

عبد الرشید اور سعادت سعید جیسے شعرا کو سمجھنے اور پرکھنے کی ہمت کہاں سے لائیں گے کہ ان کی تفہیم کے لئے سماجی کروٹوں سے آگاہ ہوتا لازم ہے اور ان کے انسانی نفسیات پر مرتب ہونے والے نقوش سے بھی۔

جمیل الرحمٰن کا تعلق ستر کی دہائی کے شعرا سے ہے۔ یہ اردو شاعری کے قدیم تہذیبوں کی طرف پلٹ کر دیکھنے اور داستانوی علائم کو نئی معنویت کے ساتھ اظہار کا وسیلہ بنانے کا زمانہ ہے۔ نسرین انجم بھٹی، ثروت حسین، افضال احمد سید، سارا شگفتہ اور عذرا عباس وغیرہ نظم اور محمد اظہار الحق، عرفان صدیقی اور ثروت حسین غزل میں اس تہذیبی علامتی نظام کے ظہور کے اہم حوالے ہیں۔ ان سبھی لوگوں نے نثری نظم کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور بظاہر یہ صنف ابلاغ کی سطح کو بہتر بنانے کے لئے استعمال کی گئی ہے مگر اس عہد کی شاعری کے گہرے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ نثری اسلوب منتخب کرنے کے باوجود شاعر کے تخیلی رنگ کی چھوٹ بہت نمایاں اور واضح نہیں ہے۔ معانی اور فکری استدلال علائم اور اشاروں میں بٹے ہوئے ہیں اور موزیک کی طرح تخیلی شگفت ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے جسے سمجھنے کے لئے لسانی، فکری، نفسیاتی اور ادراکی گرہوں کو کھولنا ضروری ہے اور اس کشاد کے لئے شعر فہمی کی عمومی تربیت ہمارے کام کی نہیں۔

"کنارشی" ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ یہ فکری دمک اور اس کے دائمی نقش کے مابین کی دھندلی شبیہ سی ملتی جلتی کوئی شے ہے جو آسانی سے قابو میں نہیں آتی کہ یہ اساطیری، علمی، سماجی اور معاشرتی علائم میں گندھی ہوئی ہے اور شاعر کو اس کی وضاحت اور بھڑک اٹھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ خواب میں بڑھتے ہوئے قدموں کا سفر ہے جو کبھی کابوس میں بدلتا محسوس ہوتا ہے اور کبھی احیائے ہوش کا اشارہ پاتے ہی پچک کر ایک غیر مرئی نقطہ بن جاتا ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے مگر اس کی معنویت کا سراغ بھی نہیں لگا پاتے۔

میں اس معنوی اخفا کی کئی مثالیں پیش کر سکتا ہوں مگر اس عمل سے اس لئے باز رہوں گا کہ میں جمیل الرحمٰن کے شعری لحن کو کسی سے مماثل قرار نہیں دینا چاہتا اور یہ حقیقت ہے کہ اس حوالے سے وہ اپنی مثال آپ ہیں اور ان کے لحن کو خالص ان کا لحن قرار دینے میں کوئی ہرج ہے نہ دشواری۔

"کمارشی کی گنگ آنکھیں میرے لبوں پر
پپڑیوں کی طرح جمی ہیں
میرے ہونٹ آواز سے خالی ہیں
اور میں کانچ سے بھی نازک
ایک ایسے موہوم کیپسول میں بند ہوں
جس کے شیشے سیاہ ہیں
وہ ساؤنڈ پروف ہے
اور اس کی ساحر دیواروں پر

کوئی بیرونی ضرب کارگر نہیں ہوتی!"

یہ جمیل الرحمٰن کی نظم "کنارِ شی" کا پہلا ٹکڑا ہے۔ ذرا اس منظرنامے پر غور کیجئے۔ کیا یہ گزری ہوئی کل کی کتھا ہے یا آنے والے زمانوں کی خبر دیتا ہوا الہام۔ میں نے اس نظم کو کئی بار پڑھا اور مجھے یہ نظم اپنے موجود سے ہارے ہوئے فرد کی کتھا دکھائی دی جسے اساطیر، وجودی اضطراب، زمانی جدل اور سائنسی اثرات کے عناصر اربعہ سے بنا اور تشکیل دیا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ "کنارِ شی" ایک ترکیبی صفاتی اسم ہے جو عقل، خود مکتفی جمالی، تخلیقی اور تاثیری اہلیت، غیر محدود ذہانت، اعتماد، اصول پرستی، شعوری انسلاک، اُنس اور تخلیقی رفعت کا استعارہ ہے اور اس کے باوجود وہ زمینی خداؤں کا باج گزار اور اپنی سری قوت سے محروم ہے۔ اس پر ستم یہ کہ شاعر کی ذات ظاہر ایک ناقابلِ شکست خول میں محبوس ہے اور اپنے طلسمی عصا کو استعمال کر کے موجود کے جبر کو توڑنے سے معذور ہے۔ یوں یہ نظم ایک ہاری ہوئی روح کا المیہ بن جاتی ہے۔

یہی سریت اور منتشر بلاغت جمیل الرحمٰن کے نظموں کے اس مجموعے کی تخصیص ہے۔ "کنارِ شی" اور اس سے پہلے کی کتابوں میں زبان اور آہنگ کے کتنے ہی رنگ آزما دیکھے ہیں۔ موضوع اور ہم عصریت کے حوالے سے بھی اس نے ایک کشادہ میدان میں رم کر دیکھا ہے اور اس کی شاعری ذات سے زیادہ عمرانی معاملات سے معاملت کرتی رہی ہے مگر "کنارِ شی" میں پہلی بار اسے اپنے آپ کو دریافت کرنے کی ضرورت پڑی ہے۔ اس کتاب کی نظمیں ایک معدوم ہوتے ہوئے نقش کو سنبھالنے اور اجاگر کرنے کی سعی ہیں۔ ایک ایسا نقش جو واضح ہے نہ مربوط۔ اس لئے یہ کتاب ایک بصری تجریدیت لئے ہے اور مناظر مرتب ہوتے ہوئے بھی غیر مرتب اور ان دیکھے محسوس ہوتے ہیں۔ شاعر نے ان کی بے ترتیبی کو کسی رلی میں پرونے کی سعی نہیں کی۔ اس لئے ان کی عجوبہ ہیئت اور عدم موانست برقرار رہتی ہے اور ابلاغ کی کیفیت کو منتشر رکھتی ہے۔

خیر تجریدیت کوئی انجان شئے ہے نہ لایعنی قدم۔ اپنے خیال کی رَو، زندگی کی لہر، غیاب سے نازل ہونے والی کیفیتیں اور بے ترتیب معمولاتِ زندگی پر نظر ڈالیں تو اپنے ظاہر و باطن میں ہر امر تجریدی ہے جسے نظم کرنے کی صورت ہمارا شعور پیدا کرتا ہے اور وہ لاشعور میں جا کر ایک بار پھر تجریدی کنایہ بن جاتا ہے۔ کارِ زیست کا نظم ہم سے ہے اور یہی نظم ہمارے تخلیقی اظہار کی سمت متعین کرنے کا ذمہ دار۔ ایسے میں اگر خیال کی تجریدیت اپنی بحالی کا راستہ نکال پاتی ہے تو یہ شعری ذات ظاہر کی شکتی کی بدولت ہے اور "کنارِ شی" کا شاعر اس شکتی سے اچھی طرح بھرا ہوا ہے۔

میرا کہا نادیدہ خندقوں میں گرتا
اور الفاظ کو بے قیمت کر دیتا ہے
ناکام اداکاران کی تھرتھراتی گونج سے
ایک فلاپ فلم تخلیق کرتے ہیں

کوئی میری گفتگو کے حوالے بدل دیتا ہے
یا پھر میں ہی حوالوں سے تہی
بات کرتا ہوں
میری زبان اور آنکھیں
آئینے سے میرا حروف میں منقسم چہرہ سمیٹتی ہیں
اور میں اجناس سے خالی بازار میں
اپنے وجدان اور ردِّ عمل سے بھرے تھیلوں کے ڈھیر لگاتا ہوں
جن کی آواز سماعتوں کی خندقوں پر تھرتھراتی رہتی ہے
لفظ اپنی اہانت کا انتقام لینے کے لیے
میری سوچ پر پہرے بٹھاتے ہیں
لیکن میرے باطن کی بغاوت فرو نہیں کر پاتے
میں لکھتا ہوں
بار بار مرنے اور زندہ ہونے کے لیے
میں ترسیل کے جس عذاب میں مبتلا ہوں
اس کے ارد گرد نادیدہ سماعتوں کی خندقیں ہیں
پر تعفن، کاٹھ کباڑ سے اٹی ہوئیں

("کمیو نیکیشن" ص ۳۲۰/۳۱۹)

اپنی اس کتاب کی کلید جمیل الرحمٰن نے کتاب کے آغاز میں "میری نظمیں" کے عنوان تلے فراہم کی ہے لکھتے ہیں۔

"اپنی نظموں کا متکلم میں نہیں ہوں۔ میری اندر پھیلی ہوئی ایک دھند ہے جو اپنی مرضی سے کسی لمحے میں مختلف چہرے بدل کر الرفاظ کی اضافت میں تجسیم ہو جاتی ہے۔ میں جس لفظ کو تراشتا ہوں۔ وہ اسے توڑ پھوڑ دیتی ہے اور خطِ مستقیم کھینچنے کے بجائے اپنا ہیولائی گراف بناتی چلی جاتی ہے۔ اس سے میرا مکالمہ ہونا ممکن ہی نہیں کہ وہ گفتگو کرنے کے بجائے حواس کو نگلنے کی قائل ہے۔ وہ مجھے عالم خواب، بیداری یا غنودگی میں جب اپنی دلدل میں کھینچتی ہے تو مجھے اپنے بچاؤ کے لئے کاغذ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔"

اس دھند میں اپنی بقا کی جنگ ہی ہے جو ان نظموں کا اصل موضوع ہے اور یہ موضوع ہے جو اس کتاب کے دھندلے ہیولائی اظہار کا سبب ہے کہ موضوع کی ندرت آہنگ اور اسلوب کی ندرت کی بنیاد ہوا کرتی ہے۔ "کنارشی" میں وہ دھندلی معنویت اور گہری مغائرت کو

جنم دیتی ہے اور اور اپنے ظہور کے لئے نثری قالب کا انتخاب کرتی ہے۔

اردو میں نثری نظم کا قالب ابھی ان چھوا ہے۔ اس ہیئت میں کچھ اچھی نظمیں لکھی گئی ہیں مگر مجموعی طور پر اس صنف کا کوئی بڑا شاعر ابھی سامنے آیا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ابھی تک آزاد نظم سے پوری طرح معاملہ نہیں کر پائے۔ راشد کی "جہاں زاد" اور مجید امجد کی چند نظموں کے سوا وحید احمد کی دو ایک نظمیں رکنے اور ساتھ چلنے پر اکساتی ہیں مگر ان میں بھی سارے طلسم کی بنیاد ڈھلا ڈھلایا آہنگ ہے۔ ہم غزل کے تربیت یافتہ ہیں اور ڈھول کی تھاپ پر ناچنے کے عادی۔ تھاپ پڑتے ہی ہمارے حواس جاگ اٹھتے ہیں اور ردھم سے ہم آہنگ ہو کر تال دینا شروع کر دیتے ہیں۔ راشد تمام عمر اس طلسم کے اسیر رہے۔ مجید امجد اپنے آخری زمانے میں اس سے آزاد ہوئے۔ ہاں! میراجی کے ہاں مسلسل انحراف کی جھلک موجود ہے اور انہیں اردو آزاد نظم کی ایسی اکلوتی آواز قرار دیا جاسکتا ہے جس نے ردھم کی مروجہ روایت سے گریز کیا۔ ایسے میں نثری نظم سے معاملہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب موضوع کسی مروجہ ہیئت میں سمانے سے منکر ہو اور شاعر کو اس کی حقانیت اور ندرت کا احساس ہو۔ نسرین انجم بھٹی، سارا شگفتہ اور اب جمیل الرحمٰن کی "کنارشی" پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ انہوں نے نثری نظم کی ہیئت کو کیوں اپنایا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی نظموں کے موضوعات نے اپنے لئے اس قالب کا انتخاب خود کیا ہے کہ وہ کسی غنائی قالب میں سمانے پر آمادہ نہیں تھے۔

" میرے لئے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا
پھول تھے یا کھینچی ہوئی کھال کی دیوار
میں وہ شہد بتا رہا تھا
جس کے طلب گار کسی حاتم سے مدد مانگنے کے باوجود اسے
حاصل نہیں کر سکتے تھے۔"

(محبت کا ڈائمیشنل اسٹر لیس۔ ص ۱۷۶)

"میں دوبارہ اس دنیا کے جبر کو
کیسے برداشت کر سکوں گا
جہاں ازل سے کشیدہ ظلم کی لکیر کے برابر
ہر دوسری لکیر اپنی پیمائش میں
چھوٹی پڑ جاتی ہے
اور لوگ استعاروں کے سہارے جینے کی کوشش کرتے ہیں۔"

(خط کا بدن ادھیڑتی سسکی)

ایک سو پینتیس نظموں میں سے میں نے صرف یہ دو بند اس آہنگ کے تعارف کے لئے دیے ہیں جو ہمیں اپنے روایتی آہنگ سے جدا کرتا ہے۔ اتفاق سے یہ دونوں ٹکڑے مونولاگ ہیں اور یہی اس کتاب کا عمومی پیٹرن ہے۔ یہ پوری کتاب ایک طویل خود کلامیہ ہے اور علامت، رمز، اساطیر اور سائنسی استدلال کے سہارے ایک دھندلی شبیہ ابھارتا ہے جو اکیسویں صدی کے انسان سے مماثل ہے بھی اور نہیں بھی۔

ہم جس عہد میں جی رہے ہیں۔ یہ خود کو کھونے اور اپنے آپ سے محروم ہونے کا زمانہ ہے۔ صارفیت زدہ معاشرے میں اکائی کی کوئی اہمیت نہیں اور ٹیکنالوجی کے زمانے میں وجود ایک حسی مغالطہ ہے۔ ''میں ہوں اس لئے کہ میں سوچتا ہوں'' اب ایک متروک مفروضہ ہے۔

''کنارشی'' سے انتخاب

تکیے پر رینگتی رات میں اسقاط

قمیص کے بٹن یکے بعد دیگرے ٹوٹتے جاتے ہیں
اور مجلد کتابوں کے صفحات میں
وہ ایک کیڑے کی طرح رینگتا ہے
دنیا ان کتابوں کی ضخامت سے بہت بڑی ہے
اور اس کی قمیص کے بٹن حروف سے
دائرہ در دائرہ
جن کے اندر سناٹا ہے اور باہر مدور شور
اس کی نصف بہتر اسے اپنا آدھا بدن ادھار دیتی ہے
اور محبوبہ آدھی روح
بستر پر اس کی نصف بہتر اور محبوبہ کے درمیان ایک تکیہ ہے
جو بھیگا رہتا ہے
مگر کبھی میلا نہیں ہوتا

اور وہ ساری رات اس پر رینگتا ہے
اس چیونٹی کی طرح جو ہاتھی کی سونڈ میں اترنا چاہتی ہو
کینچوا ہے وہ
کسی شکاری کے کانٹے میں اٹکا ہوا
دریا میں پانی کے بجائے لفظ بہتے ہیں
کوئی مچھلی نہیں
جو اسے نگل جائے
ہوا کا لمس اسے منجمد کر دیتا ہے
اور وہ کسی صحیفے کی سرحد میں لوٹ نہیں سکتا
اپنے غیاب میں سنائی گئی سزاؤں کو بھگتنے کے لیے

خوابوں کے گرتے حمل کے ساتھ
بہتے لہو سے حروف مٹتے چلے جا رہے ہیں
اسے کوئی دایہ میسر نہیں
زندگی رات کے روبہ رو
جہاں کرسی بچھا بیٹھی ہے
وہ بستر کی سائیڈ ٹیبل پر
روشن لیمپ کی آڑ لیے
خون میں لت پت
مسلسل رینگ رہا ہے۔۔۔

اُداسی

روح میں کہیں خود بخود پھوٹتی
شریانوں میں سفر کرتی
اور سانسوں میں چھینٹے اڑاتی
بہنے لگتی ہے
ایک جھرنے کی طرح
دل کے گلی کوچوں میں
اس کے ریلے کی گونج
ہوا اور فضا میں
اپنے ہونے کا اعلان کرتی
اور اس نادیدہ دنیا کی خبر دیتی ہے
جو ہمارے وجود میں سمٹتے پھیلتے ہوئے
کبھی کبھار بے قابو ہو کر
اپنے ہی کناروں سے ٹکرا جائے تو اس کا غبار
ہماری آنکھیں بھر دیتا ہے
اداسی کو تخلیق نہیں کیا جا سکتا
اسے پہنا نہیں جا سکتا
کیوں کہ یہ کسی ماپ پر پورا نہیں اترتی
اسے اوڑھا بھی نہیں جا سکتا
کیونکہ یہ آدمی کو
پل میں برہنہ کر دیتی ہے
یہ کسی کی پیاس نہیں بجھاتی
یہ کسی سوال کا جواب نہیں دیتی
صرف یہ بتاتی ہے
جیسے ہوتی ہے رگڑی ہوئی ماچس کی تیلی
اپنے شعلے کے برابر
آدمی ہوتا ہے جتنا زندہ
ہوتا ہے
اتنا ہی اداس!!!

اپنے جنم دن پر ایک نظم

کنارشی-----------KINARSHI

کنارشی کی گنگ آنکھیں میرے لبوں پر
پپڑیوں کی طرح جمی ہیں
میرے ہونٹ آواز سے خالی ہیں
اور میں کانچ سے بھی نازک
ایک ایسے موہوم کیپسول میں بند ہوں
جس کے شیشے سیاہ ہیں
وہ ساؤنڈ پروف ہے
اور اس کی ساحر دیواروں پر
کوئی بیرونی ضرب کارگر نہیں ہوتی
کنارشی
اپنی ہتھیلیوں سے چمٹے آسمان کو
ہمیشہ اپنی بند مٹھیوں میں چھپائے رکھتا ہے
اور زمین کو حقارت بھری نگاہوں سے دیکھنے کے باوجود
زمینی خداؤں سے ہار جاتا ہے
میرا aura کنارشی کے کسی کام کا نہیں
وہ پاتال کے دیوتا سے جنگ کرتے ہوئے
غلطی سے ایروس کو قتل کر کے
زیوس کی ثنا کرتا مگر اپنے خدا کو بھول جاتا ہے
اسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ اپنے گناہ کی معافی
کس خدا سے طلب کرے
وہ حیران ہو کر مجھے پکارتا ہے
لیکن میں ایک ایسے موہوم کیپسول میں بند ہوں
جو ساؤنڈ پروف ہے
اور جس کی ساحر دیواروں پر
کوئی بیرونی ضرب کارگر نہیں ہوتی!

22 جنوری 2019

جمیل الرحمان کے مطبوعہ شعری مجموعے

سفیر رامہ

ڈاکٹر منظور اعجاز کی خود نوشت پر ایک نظر

ڈاکٹر منظور اعجاز صاحب کی خود نوشت جو ابھی کچھ عرصہ پہلے پنجابی میں۔۔"بُرج والا توں واشنگٹن۔ جندڑیے: تن دیساں تیرا تانا" کے نام سے شائع ہوئی ہے اور بعد میں اسکا اردو ترجمہ ۔۔۔ "رو میں ہے رخش عمر" بھی چھپ چکا ہے۔ اس پر بات کرنا ایک لحاظ سے آسان بھی ہے، کہ تیس سال سے زائد عرصہ ان سے قریبی رفاقت رہی ہے۔ اور اسی وجہ سے مشکل بھی ہے۔ یہ صرف اُنکی ہی نہیں، ہماری پوری نسل کی داستان ہے۔ جو انہی راستوں اور ان ہی زمانوں سے گذرے ہیں جو منظور اعجاز صاحب نے بتائے ہیں۔ اور جنکی نمائندگی کا فریضہ منظور اعجاز صاحب نے اپنی خود نوشت لکھ کر بخوبی ادا کر دیا ہے۔ اب انہیں وہ خدشہ نہیں رہے گا جسکا ذکر پنجابی کے نامور شاعر سُرجیت پاتر نے یوں کیا تھا کہ:

یار میرے جو ایس آس تے مر گئے، کہ میں اوہناں دے دُکھ دا بناواں گا گیت
جے میں چُپ ہی رہیا، جے میں کُجھ ناں کیہا، بن کے روحاں سدا بھٹکدے رہن گے

ڈاکٹر منظور اعجاز صاحب نے اپنی انتہائی بھرپور زندگی کی کہانی اس طریق سے لکھی ہے کہ دو سو صفحات کے قریب کی اس نسبتاً مختصر کتاب میں اپنے زندگی بھر کے تجربات مشاہدات اور تاثرات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والوں کو اپنی زندگی کے حالات وواقعات کا ذکر کرتے ہوے اسبات کا شعور ہو ناضروری ہوتا ہے کہ کون سے حالات وواقعات لکھنے ہیں اور کون سے چھوڑ دینے ہیں۔ تاکہ یہ غیر ضروری تفصیلات سے پاک رہے۔ منظور اعجاز صاحب نے میرے خیال میں کچھ زیادہ ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ لیکن جہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت تھی اُس سے گُریز بھی نہیں کیا۔

مثلاً کتاب کا پہلا باب اور آخری باب دونوں اپنے خود کفیل گاؤں بُرج والا کے بارے میں ہیں جہاں وہ پیدا ہوئے اور بچپن گذارا۔ اسکے بارے میں آپ نے صحیح سوچا کہ اس گاؤں کا رہن سہن جو سینکڑوں سالوں پہلے سے لے کر آپ کی زندگی کے ابتدائی دور تک تبدیل نہیں ہوا تھا، وہ سارے پنجاب میں مشینی دور سے پہلے کی زندگی کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ چناچہ آپ نے پہلے باب میں اپنے گاؤں کی زندگی کے ہر پہلو کی اس تفصیل اور باریکی سے تصویر کشی کی ہے کہ یہ باب اپنی ذات میں ایک اہم تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔ جس کی اور کوئی مثال پنجابی ادب میں میرے دیکھنے میں نہیں آئی۔

پھر بات یہیں تک ختم نہیں کی۔ کتاب کے آخری باب میں آپکی زندگی کے دوران اس گاؤں میں جو غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہوئیں، جو اس سارے خطے میں بلکہ اس دور میں ساری دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی کرتی ہیں انکا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور ان تبدیلیوں کے پیچھے جو عوامل ہیں انکا بھی مارکسزم کے معاشی اور معاشرتی سائنسی اصولوں کے مطابق باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں منظور اعجاز صاحب نے اپنے بارے میں ان الفاظ میں یہ ذکر کیا ہے کہ۔

''اُس وقت کا گاؤں دنیا سے اتنا کٹا ہوا اور علیحدگی کا شکار تھا کہ کسی کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ میں گھسٹنے کی بجائے بیساکھیوں سے چل سکتا ہوں۔ وہ توکئی سال بعد میرے والد نے شہر یا کسی اور جگہ کسی کو بیساکھیوں کے سہارے چلتا دیکھا تو اُس نے گاؤں آکر ترکھان سے میرے لیے لکڑی کی بیساکھیاں بنوائیں۔ مجھے یہ یاد ہے کہ جب میں پہلی بار بیساکھیوں کے سہارے گلی میں چلا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ہوا میں اُڑ رہا ہوں۔''

آپکی باقی آپ بیتی پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ ایک بار بچپن میں بیساکھیاں مل جانے کے بعد منظور اعجاز صاحب نے پھر دوبارہ کسی اور بیساکھی کا سہارا نہیں لیا۔ آپکی زندگی ہمت اور حوصلے کے بل بوتے پر بلندیوں تک پہنچنے کی ایسی داستان ہے جس سے بہت سے سبق سیکھے جاسکتے ہیں۔

آپ نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا، اپنی ہمت اور محنت سے اسمیں بھرپور کامیابی حاصل کی۔ برج والا سے نکل کر گورنمنٹ کالج ساہیوال میں چار سال گذارے جہاں آپ پڑھائی کے ساتھ کالج اور شہر کی ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فلاسفی میں ایم اے کر کے وہیں فلاسفی کے استاد مقرر ہوئے۔ آٹھ سال لاہور میں گزارے۔ اس دوران ڈاکٹر عزیز الحق اور

پروفیسر عزیزالدین کے ساتھ مل کر یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے باہر بائیں بازو کی سیاست اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ جیل کی ہوا بھی کھائی۔ ریڈیو اور ٹی وی پر پروگرام کیے۔ پنجابی زبان کے حق میں چلنے والی تحریک میں شامل ہوئے اور اسمیں ایک بہت اہم کردار ادا کیا۔ پنجابی ادبی مرکز کے نام سے کتابیں شائع کرنے کا ادارہ قائم کیا اور اسے کامیابی سے چلایا۔ پنجابی سنگت کی بنیاد ڈالی جس کے ذریعے اسوقت سے لے کر اب تک نجم حسین سید کی قیادت میں پنجابی زبان کے فروغ کے لیے ہر اعتبار سے ایسا بھرپور کام ہوا ہے جو شاید کئی یونیورسٹیاں بھی مل کر نہ کر سکتیں۔

جس وقت منظور اعجاز صاحب نے پنجابی زبان کے لیے کام شروع کیا اسوقت چند لوگ ہی پنجابی کے نام لیوا تھے۔ پنجابی زبان کہیں بھی پڑھائی نہیں جاتی تھی۔ بابا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، وارث شاہ، سلطان باہو، میاں محمد اور خواجہ فرید کے پائے کے پنجابی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی کتابوں کی عملاً تعلیمی اداروں میں داخلے پر پابندی تھی۔

اب یہ حال ہے کہ پنجاب کی زیادہ تر یونیورسٹیوں میں پنجابی ڈیپارٹمنٹ قائم ہو چکے ہیں۔ جہاں سے ہر سال سینکڑوں طلباء ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ سرکاری کالجوں میں پنجابی اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے جس سے ہزاروں طالب علم فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پنجاب کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں پنجابی کی متعدد تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ پاکستان میں پنجابی کو اس مقام تک پہنچانے میں منظور اعجاز صاحب کی کاوشوں کا بھی ہاتھ ہے۔ آپ آج بھی امریکہ میں بیٹھ کر تندہی سے پنجابی زبان کی خدمت میں مصروف ہیں۔

۱۹۷۸ میں امریکہ آنے کے بعد منظور اعجاز صاحب کو ان تمام مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن سے سب تارکین وطن کو واسطہ پڑتا ہے۔ ان مشکلات کے باوجود آپ نے سے ہوورڈ یونیورسٹی سے اکنامکس میں پی ایچ ڈی مکمل کی۔ کچھ دیر ایک کالج میں اکنامکس پڑھانے کے بعد آپ نے واشنگٹن ڈی سی کی لوکل گورنمنٹ میں ماہر شماریات کے طور پر بیس سال کام کیا۔

امریکہ آنے کے بعد شروع کے دنوں سے ہی منظور اعجاز صاحب نے تعلیم اور کیریر کے لیے جدوجہد کے ساتھ اپنی ادب اور فن کی دلچسپیوں کو پورا کرنے کے راستے بھی نکال لیے۔ اور دوستوں کے ساتھ مل کر انڈوپاک سرکل کے نام سے ایک ڈرامہ تنظیم بنائی جس نے واشنگٹن ڈی سی کے علاقے میں پہلی بار گرین کارڈ کے نام سے اردو ڈرامہ اسٹیج کیا۔ اگلے چند سالوں میں انڈوپاک سرکل کی طرف سے اور بھی کئی اردو اور پنجابی اسٹیج ڈرامے پیش کیے گئے۔ اسکے بعد منظور اعجاز صاحب اور کچھ اور پنجابی کہ چاہنے والوں نے مل کر اکیڈمی آف دی پنجاب ان نارتھ امیریکہ (اپنا) کے نام سے ایک پنجابی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ جس نے ہندوپاک کے پنجابیوں کو ساتھ ملا کر پنجابی کانفرنسوں، مشاعروں، ادبی محفلوں، اسٹیج ڈراموں، شاہ مکھی اور گرمکھی میں ایک پنجابی رسالے اور پنجابی کتابوں کی چھپائی، اور پنجابی کے فروغ کے لیے دوسرے کاموں کا سلسلہ شروع کیا۔ جو آج تک جاری ہے۔ اپنا کی انٹرنیٹ پر پنجابی ویب سائٹ (http://www.apnaorg.com) ساری دنیا کے پنجابی حلقوں میں مقبول ہے اور بڑی تعداد میں پڑھی جاتی ہے۔

امریکہ میں رہتے ہوئے بھی منظور اعجاز صاحب کی پاکستان کے معاملات سے دلچسپی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ آج سے کوئی تیس سال

پہلے آپ نے کچھ جرنلسٹوں اور دانشوروں کے ساتھ مل کر ایک اور ادارے واشنگٹن پالیسی انیلسز گروپ (Washington Policy Analysis Group) کی بنیاد رکھی تھی جو آج بھی قائم ہے۔ اسمیں پاکستانی سیاستدانوں، صحافیوں اور دیگر اہم لوگوں کو ڈنر اور تبادلہ خیالات کے لیے بلایا جاتا ہے۔ پاکستان میں شاید ہی کوئی اہم سیاسی شخصیت ہو جو اس میں شرکت نہ کر چکی ہو۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی جہاں پاکستانی آباد ہیں اتنا عرصہ چلنے والے اس قسم کے ادارے کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ اسکے علاوہ ۱۹۸۸ میں منظور اعجاز صاحب نے پاکستانی اخباروں میں کالم لکھنے شروع کیے اور یہ سلسلہ بھی اب تک چل رہا ہے۔ ان دنوں بھی وہ جنگ اخبار میں ہفتہ وار کالم لکھ رہے ہیں۔ آپ کے انگریزی کالموں کا ایک مجموعہ اور پنجابی میں ایک درجن سے زائد کتابیں چھپ چکی ہیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں ذکر کیا ہے، اتنی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہونے اور اتنی بھرپور زندگی گذارنے کے باوجود منظور اعجاز صاحب کی خودنوشت فقط کوئی دوسو صفحوں پر مشتمل ہے۔ اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اکثر خودنوشتوں میں مصنف کو جن نامور لوگوں کو ملنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہوتا ہے ان کے تذکروں سے صفحوں کے صفحے بھرے ہوتے ہیں۔ منظور اعجاز صاحب کو بھی ان گنت اہم شخصیتوں کے ساتھ کام کرنے اور ذاتی تعلقات رکھنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن ان کا تذکرہ موقع محل کے مطابق ایک دو یا چند فقروں سے زیادہ نہیں کیا۔

اسی طرح جو بعض غیر معمولی اہمیت کے کام انہوں نے کیے ہیں، انکا ذکر تو کیا ہے لیکن انکی اہمیت کا پرچار کرنے کی بجائے یہ بات قاری پر چھوڑ دی ہے کہ وہ خود ہی انکے کام کی اہمیت کا اپنی استطاعت کے مطابق اندازہ کر لے۔ میں ایک مثال دے کر اپنی بات ختم کروں گا۔ کچھ عرصہ پہلے وارث شاہ کی ہیر پر پانچ جلدوں اور کوئی ۱۴۰۰ صفحوں پر مشتمل آپ کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ جو آپ کے عمر بھر کے ہیر وارث شاہ کے مطالعے کا نچوڑ ہے۔ اسکا ذکر آپ نے اپنی سرگذشت میں یوں کیا ہے۔

''میں نے ساری عمر وارث شاہ کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ اسی لیے میں نے اسکی مکمل تشریح کرنے کا کام شروع کیا۔ میں نے یہ تشریح بندوار کی۔ اور ہر بند کے تین جزو بنائے۔ پہلے بند کا متن، پھر اسکے مشکل الفاظ کے معنی دے کر سادہ اور تفصیلی تشریح کی۔ اس طرح کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ قاری جتنا پڑھنا چاہے پڑھ لے اور اگر اسنے تفصیلی بحث میں نہیں پڑنا تو نہ پڑے۔''

منظور اعجاز صاحب نے تو اتنا کہہ کر بات ختم کر دی۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۶۶ سے لیکر جب ہیر لکھی گئی، گذشتہ ۲۵۳ سالوں میں ہیر کی اتنی مکمل، جامع اور مفصل شرح کسی نے نہیں لکھی۔ یہ بات نہیں کہ ہیر پر ریسرچ کا کام نہیں ہوا۔ ہیر چھاپے خانے سے تو پہلی بار ۱۸۶۵ میں لاہور کے ہُوپ پریس سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ لیکن اس سے پہلے جب ابھی اسکے بہت کم قلمی نسخے دستیاب تھے یہ سینہ بہ سینہ چل کر سارے پنجاب میں پھیل چکی تھی اور اسنے سب پنجابیوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ اور جیسا کہ اردو کے مشہور شاعر اِنشااللہ خان اِنشا، جنکی تاریخ وفات ۱۸۱۷ ہے، کے ایک شعر سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ہیر کی شہرت وارث شاہ کی وفات کے بعد چند دہائیوں میں پنجاب سے باہر بھی پہنچ چکی تھی۔ اِنشا کا شعر ہے۔

سُنا یارات جو قصہ ہیر رانجھے کا۔ تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لُوٹ لیا

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں جو ۱۷۹۹ سے ۱۸۳۹ تک کا ہے، ہیر کا اتنا شہرہ ہو چکا تھا کہ رنجیت سنگھ نے وارث شاہ کے خاندان کو ۱۳۰۰۰ ایکڑ اراضی انعام میں دی جو اب بھی اس خاندان کی تین شاخوں میں بٹی ہوئی پشتوں کی ملکیت ہے۔

جب ہیر چھپنی شروع ہوئی تو کئی مسائل کھڑے ہو گئے۔ کچھ چھاپے خانے والوں نے ہیر کی مقبولیت دیکھ کر اسکی ضخامت میں اضافہ کرنے کے لیے اسمیں الحاقی بند شامل کرنے شروع کر دیے۔ اس بات کی بھی احتیاط نہ کی گئی کہ ہیر کے قلمی نسخوں کی چھان پھٹک کر کے مستند نسخے چھاپے جائیں۔ بعد میں کئی دہائیوں تک پنجابی دانشوروں کا بہت سا وقت ہیر کا متن درست کرنے میں صرف ہوا۔ وارث شاہ ایک بہت بڑا جینیئس تھا۔ اسنے ہیر اس انداز میں لکھی کہ ایک ان پڑھ دیہاتی سے لیکر دانشوروں تک سب اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ویسے تو وارث شاہ کی ہیر کے بہت سے پہلوؤں پر کام ہوا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کسی نے یہ کوشش نہیں کی تھی کہ شروع سے آخر تک وارث شاہ کی گہری سوچ کے تسلسل کو سمجھا جائے اور اس تناظر میں ہیر کی مکمل شرح لکھی جائے۔ منظور اعجاز صاحب نے ہیر کی مکمل شرح لکھ کر اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ آپ نے وارث شاہ کی ہیر کو پوری طرح سمجھنے کا ایک نیا پیمانہ مقرر کر دیا ہے۔ جس سے اختلاف کی گنجائش تو بہر صورت موجود رہے گی لیکن اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسطرح کی اور کئی مثالیں منظور اعجاز صاحب کی خودنوشت میں ملتی ہیں جہاں اُنہوں نے اپنے کسی غیر معمولی اہمیت کے کام کا ذکر کر کے اسکی افادیت کا اندازہ لگانا قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

منظور اعجاز صاحب کی زندگی کی کہانی بُرج والا سے شروع ہوئی اور ابھی واشنگٹن میں چل رہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا کرے ابھی اور طویل عرصے تک چلتی رہے۔ شکریہ۔

(سوسائٹی آف اردو لٹریچر یو ایس سے کی جانب سے منظور اعجاز کی خودنوشت کی رونمائی تقریب میں پڑھا گیا)
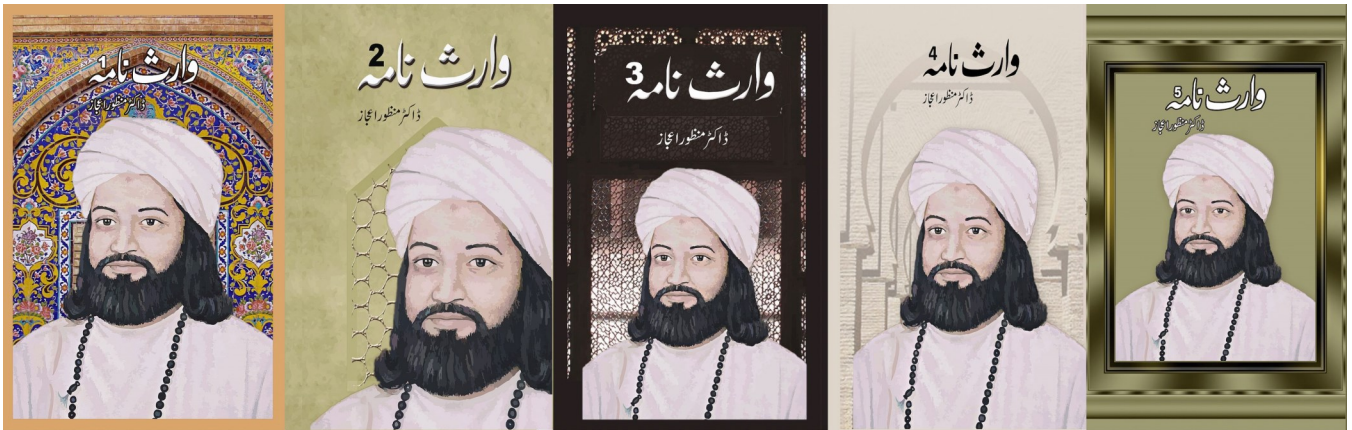
انجینئر محمود مجیب اختر

ٹی آئی کالج کا سنہری دور

حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب ایم اے (آکسن) تعلیم الاسلام کالج کے بانی پرنسپل تھے۔ آپ کا بطور پرنسپل 7 مئی 1944ء کو تقرر ہوا اور آپ 7 نومبر 1965ء تک ٹی آئی کالج کے پرنسپل رہے حتی کہ 8 نومبر 1965ء کو اللہ تعالیٰ نے آپ کو "خلیفۃ المسیح الثالث" کے عظیم منصب پر فائز کر دیا۔

ٹی آئی کالج کا آغاز مرکز احمدیت قادیان دارالامان سے ہوا اور پاکستان ہجرت کے بعد کچھ عرصہ لاہور میں رہا اور اس کے بعد اپنی نئی بلڈنگ میں دارالہجرت ربوہ شفٹ ہو گیا جو آپ نے خود اپنی نگرانی میں بڑی محنت سے تعمیر کروائی تھی۔

آپ کی شخصیت

ایک مرتبہ غالباً 1993ء لاہور میں اتفاقاً میری ایک مشہور جرنلسٹ سلطان ایف حسین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہیں نے بتایا کہ 1950 میں انہیں حضرت مرزا ناصر احمد صاحب (پرنسپل ٹی آئی کالج لاہور) کے ساتھ سیکرٹری پنجاب بیڈ منٹن ایسوسی ایشن کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت آپ پنجاب بیڈ منٹن ایسوسی ایشن کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ وہ بے ساختہ بولے:

”صاحب زادہ صاحب بہت خوش اخلاق، پڑھے لکھے، قابل، آکسفورڈ کے گریجوایٹ ہونے کے باوجود آپ کی طبیعت میں بہت سادگی تھی۔ بڑی قدر کرنے والے اور عزت دینے والے وجود تھے لیکن ان کا نورانی چہرہ ان کی شخصیت کا سب سے روشن پہلو تھا “

(حیات ناصر جلد اول سیرت و سوانح نافلہ موعود حضرت مرزا ناصر احمد رحمہ اللہ خلیفۃ المسیح الثالث صفحہ 155)

عشق الہٰی وسے منہ پر ولیاں ایہہ نشانی

آپ نہ صرف علمی اور خاندانی لحاظ سے بہت بڑا مقام رکھتے تھے بلکہ روحانیت میں بھی آپ کا بڑا مقام تھا۔

جذبات دل

آپ کی پرانی ڈائریوں میں سے حضرت سیدہ طاہرہ صدیقہ ناصر صاحبہ کی وساطت سے آپ کے بچپن کی ایک نظم ملی ہے جو آپ کے پاکیزہ جذبات اور بلند ارادوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

دنیا کے کام بے شک کرتا رہوں گا میں بھی
لیکن میں جان و دل سے اس یار کا رہوں گا
برقی خیال دل میں سر میں رہے گا سودا
اس یار کو میں بھولوں اتنا نہ محو ہوں گا
چمکوں گا میں فلک پر جیسے ہو کوئی تارا
بھولوں کو رہ پہ لاوے ایسی میں شمع ہوں گا
سورج کی روشنی بھی مدھم ہو جس کے آگے
ایسا ہی نور حاصل اس نور سے کروں گا
عالم کو میں معطر کر دوں گا اس مہک سے
خوشبو سے جس کی ہر دم مدہوش میں رہوں گا
اخلاق میں میں افضل، علم و ہنر میں اعلیٰ
احمد کی رہ پہ چل کر بدر الدجیٰ بنوں گا
سارے علوم کا ہاں منبع ہے ذات جس کی
اس سے میں علم لے کر دنیا کو آگے دوں گا
مجھ میں تڑپ وہ ہوگی بجلی بھی جھینپ جائے
دل عشق سے بھروں گا اور بے قرار ہوں گا
اکسیر جو بنا دے اکسیر میں وہ ہوں گا
جو کچھ کہوں زبان سے ناصر میں کر دکھاؤں
ہو رحم اے خدایا، تا تیرے فضل پاؤں
(مرزا ناصر احمد 14 مارچ 1928ء)

ٹی آئی کالج کی خوشگوار یادیں

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی اجازت سے عرفان احمد خان صاحب (دہلوی) ہر اتوار وائس آف جرمنی سے Talim ul Islam College Memories کا پروگرام کر رہے ہیں اور اب تک 105 پروگرام ہو چکے ہیں۔ یہ پروگرام تعلیم الاسلام کالج کے نام کو زندہ رکھنے اور کالج اور اساتذہ اور نامور طلباء کی یادوں کو زندہ رکھنے کا بڑا دلچسپ ذریعہ ہیں۔ اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ٹی آئی کالج کے ہزاروں اولڈ سٹوڈنٹس اور اساتذہ اس پروگرام سے استفادہ کر رہے ہیں۔ براعظم افریقہ سے بھی بعض طالب علم ربوہ آکر پڑھتے تھے۔ مجھے محمود ایس مونٹے یاد ہیں جو انگلش کے زبردست debater بھی تھے اور بہت اچھی انگلش بولتے تھے۔ ان سے کوئی debate میں جیت نہیں سکتا تھا۔ المنار رسالہ کے انگلش سیکشن کے ایڈیٹر بھی تھے۔ پاکستان سے بعض مخالفین احمدیت کے بچے بھی

بلاروک آکر پڑھتے تھے۔ بھیرہ کے پیر محمد کرم شاہ صاحب کا ایک بھانجہ پیر محمد اکرم شاہ بھی 1961ء میں ٹی آئی کالج ربوہ میں داخل ہوا تھا۔ اسی طرح ائر فورس کے بعض افسروں کے بچے ربوہ آکر پڑھتے تھے۔ ہمارے ایک کلاس فیلو محمود سلطان باجوہ جو ایف ایس سی پری انجینئرنگ میں اول آئے تھے ائر فورس کے ایک افسر کے بیٹے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈگری لے کر انہیں ائر فورس میں کمیشن مل گیا تھا اور ائر کموڈور تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے ایک کزن غلام مصطفیٰ باجوہ صاحب بھی ٹی آئی کالج کے سٹوڈنٹ رہے ہیں اور عرفان احمد صاحب کے پروگراموں میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح صوبہ سرحد کے بعض بڑے خاندانوں کے بچے ٹی آئی کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔

ٹی آئی کالج میں آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ ہوا کرتے تھے ان کی الگ تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔ دنیا جہان کے دانشور، شاعر، سائنس دان، عرب وعجم سے آکر وزٹ کرتے تھے۔

کالج بلڈنگ کی تعمیر

جب آپ کو حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا کہ لاہور سے آکر ربوہ میں کالج کی بلڈنگ بنوائیں تو آپ نے دھوپ میں کھڑے ہو کر ایک ایک اینٹ اپنے سامنے لگوائی۔ دن رات ورک سائٹ پر گزارا۔ دارلضیافت سے آپ کا کھانا آتا تھا۔ آپ نے اپنا کھانا پینا آرام سب کچھ تعمیراتی کام میں قربان کیا ہوا تھا۔ فنڈز کی کمی تھی نقشے پر تھوڑا تھوڑا حصہ مارک کر کے حضرت مصلح موعود سے اجازت لیتے تھے اور حضور دریافت فرماتے کہ کیا اتنا حصہ تعمیر کرنے کے لئے رقم ہے۔ نہایت کفایت شعاری سے کام کر کے آپ نے کالج کی تعمیر کی۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا:

"جب میں نے کالج کا نقشہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے حضور پیش کیا تو آپ مسکرائے اور فرمایا اتنا بڑا کالج بنانے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں تمہیں ایک لاکھ روپیہ کالج کے لئے اور پچاس ہزار ہوسٹل کے لئے دے سکتا ہوں۔۔۔۔ پس انجینئر سے مشورہ کر کے اس نقشہ پر سرخ پنسل سے نشان لگواؤ کہ لاکھ سے بلڈنگ کا اتنا حصہ بن جائے گا۔ وہ میں نے تم سے بنا ہوا لینا ہے۔ میں نے اس وقت جرأت سے کام لیتے ہوئے حضور کی خدمت میں عرض کیا۔ ٹھیک ہے۔ میں حضور سے پیسے مانگنے نہیں آیا نقشہ منظور کروانے آیا ہوں۔ اس لئے حضور دعا فرمادیں۔ میں لکیریں لگوا کر لے آؤں گا لیکن مجھے اجازت دی جائے کہ جماعت سے عطایا وصول کر سکوں۔ حضور نے فرمایا۔ ٹھیک ہے عطایا وصول کرو لیکن لکیریں لگوا کر لاؤ۔۔۔۔۔

اللہ تعالیٰ نے ہر مرحلہ پر آگے بڑھنے کی توفیق دیتا چلا گیا۔۔۔ آج تک مجھے (جو خرچ کرنے والا تھا) پتہ نہیں کہ یہ رقم کہاں سے آئی۔۔ یہ کالج کی عمارت، ہوسٹل اور دوسری بلڈنگیں ہیں وہ سب ملا کر ایک لاکھ مربع فٹ سے اوپر ہیں اور میرا صرف اندازہ ہے کہ ان پر چھ سات لاکھ کے درمیان خرچ آیا ہے۔ بعض دفعہ پڑھے لکھے غیر از جماعت دوست یقین نہیں کرتے کہ اتنی تھوڑی سی رقم میں یہ اتنی بڑی عمارت کھڑی ہوسکتی ہے۔۔۔" (حیات ناصر جلد اول صفحہ 190-191)

کالج کی حالت پر اظہار تاسف

23 مارچ 1982ء کو آپ نے صدر انجمن احمدیہ پاکستان کے احاطہ میں بیت الاظہار بلڈنگ کا سنگ بنیاد رکھا اور اسی روز ظہر کی نماز کے بعد آپ نے ان انجینئرز اور آرکیٹکٹس کو کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا جنہوں نے قصر خلافت اور دفتر پرائیویٹ سیکرٹری بلڈنگس کی تعمیر کی نگرانی کے لئے وقف عارضی کیا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد تقریباً دو گھنٹے کی آپ کے ساتھ نشست ہوئی جس میں کئی موضوع زیر بحث آئے۔ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی تعمیر کا تفصیلی ذکر بھی فرمایا اور قومیائے جانے کے بعد کالج اور کالج بلڈنگ کی حالت زار پر آپ نے گہرے تاسف کا اظہار فرمایا۔ آپ نے فرمایا اگر مجھے علم ہوتا کہ انہوں نے کالج کا یہ حشر کرنا ہے تو میں اسکے نیچے mine بچھا دیتا اور blast کر دیتا۔ اتفاق سے اس دعوت کی چند تصاویر بھی میرے پاس ہیں جو بہت مدھم ہیں تاہم ایڈیٹر صاحب کو ارسال کر رہا ہوں تا کہ اگر ممکن ہو تو اس مضمون کے ساتھ شائع کر دیں۔

المنار رسالہ

ٹی آئی کالج کی یاد میں آج کل برطانیہ، جرمنی اور امریکہ سے المنار رسالہ شائع ہوتا ہے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل ٹی آئی کالج نے کالج کے لئے یہ علمی مجلہ _ المنار 1950ء میں جاری فرمایا جب کہ کالج ابھی لاہور میں تھا۔ آپ نے اپنے پیغام میں تحریر فرمایا تھا

"زندگی مسلسل جستجو کا نام ہے_ کلاس روم میں آپ پہلوں کی جستجو کے نتائج سنتے ہیں۔انہیں سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں_ ان نتائج پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کا آپ کو موقع میسر نہیں آتا۔کلاس روم تخلیق کا میدان بھی نہیں مگر تنقید و تحقیق کے بغیر آپ کی زندگی بے معنی ہے ۔"پدرم سلطان بود" آپ کو زیب نہیں دیتا۔ دنیا کو جس حالت پر آپ نے پایا اس سے بہتر حالت پر آپ نے اسے چھوڑنا ہے. کالج میگزین تنقید و تحقیق کا ایک وسیع میدان آپ کے سامنے کھولتا ہے۔ اب آپ کا فرض ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ دیدہ بینا سے دنیا کو دیکھیں۔ عقل سلیم سے اسے پرکھیں۔ ذہن رسا سے اس کی غیر معروف وادیوں میں داخل ہوں۔ اس کی چھپی ہوئی کانوں میں جائیں اور آنے والی نسلوں کے لئے دُرِ بے بہا تلاش کریں۔ اسلام کو آج روشن دماغ بہادروں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ بہادر تو ہیں مگر آپ کے ذہنوں میں جلا نہیں تو آپ اسلام کے کسی کام کے نہیں۔ آزادانہ تنقید و تحقیق آپ کو بہادر بھی بنائے گی اور آپ کے اذہان کو منور بھی کرے گی اور یہی کالج میگزین کے اجراء کا مقصد ہے۔ خدا ہمیں اس میں کامیاب کرے۔"(حیات ناصر جلد اول صفحہ 152..153)

کالج کے سنہری دور کی طویل داستان ہے جسے عبید اللہ علیم کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

لکھو تمام عمر مگر پھر بھی تم علیم
اس کو دُکھا نہ پاؤ وہ ایسا حبیب تھا

ایک پاکستانی نژاد امریکن احمدی کا اعزاز

ڈاکٹر چوہدری صفی اللہ وڑائچ آف Vineland, New Jersey کے صاحبزادے اور مکرم چوہدری عطاء اللہ خاں وڑائچ آف رام تارڑ ضلع حافظ آباد کے پوتے طارق ہبتہ اللہ چوہدری امریکہ کی نیو جرسی سٹیٹ میں Superior Court کے جج مقرر ہوئے ہیں۔

گورنر نیو جرسی جناب عزت مآب Philip D. Murphy نے انہیں اس سال کے آغاز میں اس عہدہ کے لئے نامزد کیا تھا۔ اس نامزدگی کے بعد آئین کے مطابق Senate Judiciary Committee نے 18 مئی 2023 کو اُن کی تقرری کی منظوری دی اور پھر 22 مئی 2023 کو سینیٹ کے فل ہاؤس میں تمام ووٹ طارق ہبتہ اللہ چوہدری کے حق میں ڈالے جانے کے بعد چیف جسٹس نے 23 مئی 2023 کو اُن کی تقرری کا نوٹیفیکیشن جاری کر دیا ہے۔

نیو جرسی کے نئے Superior Court Judge، چوہدری مجیب اللہ وڑائچ آف فلاڈیلفیا اور ڈاکٹر حافظ چوہدری سمیع اللہ وڑائچ آف نارتھ جرسی کے بھتیجے ہیں۔ ادارہ المنار اپنی اور تعلیم الاسلام کالج المنائی یو۔ایس۔اے کی جانب سے عزیزم طارق چوہدری، مکرم صفی اللہ صاحب اور تمام اہل خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزم طارق چوہدری کو مزید کامیابیاں عطا کرتا چلا جائے۔ آمین۔

پہلے پاکستانی امریکن Superior Court جج طارق ھبتہ اللہ چوہدری نے اپنے عہدے کا حلف اٹھالیا
انہوں نے قرآنِ کریم پر حلف لینے کی سعادت حاصل کی

امریکہ کی نیوجرسی سٹیٹ کے نئے Superior Court جج طارق ھبتہ اللہ چوہدری قرآنِ کریم پر اپنے عہدے کا حلف اٹھارہے ہیں۔ درمیان میں اُن کے چچاڈاکٹر چوہدری سمیع اللہ وڑائچ آف نارتھ جرسی، جو خود بھی حافظِ قرآن ہیں، قرآنِ کریم کا مصحف اٹھائے ہوئے ہیں جس پر نئے جج صاحب نے اپناایک ہاتھ رکھاہوا ہے، جبکہ طارق ھبتہ اللہ چوہدری کے Assignment جج اُن سے حلف لے رہے ہیں۔ حلف والے قرآنِ کریم کا یہ نسخہ طارق ھبتہ اللہ چوہدری کو اُن کے دادا مکرم چوہدری عطاء اللہ خاں وڑائچ آف رام تارڑ ضلع حافظ آباد نے اُن کی تقریبِ آمین پر دیا تھا۔

نیچے والی تصاویر میں تینوں بھائی، ڈاکٹر چوہدری صفی اللہ وڑائچ، چوہدری مجیب اللہ وڑائچ اور ڈاکٹر حافظ چوہدری سمیع اللہ وڑائچ، جج صاحب کو اُن کے نئے عہدے کا گاؤن پہنانے کے بعد Assignment جج کے ساتھ کھڑے ہیں۔

واضح رہے کہ حلف برداری کی یہ تقریب 14 جون 2023 کو Cumberland Courthouse, Bridgeton New Jersey میں منعقد ہوئی، جس میں قریبی خاندان کے افراد کے علاوہ متعدد Superior Court ججز اور عدالت کے عملہ نے شرکت کی۔
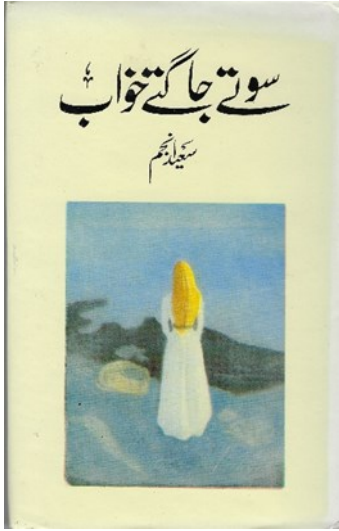
یادِ رفتگان

تین عدد افسانوں کے مجموعہ جات (سب اچھا ہو گا، سوچیں اور سوتے جاگتے خواب) کے خالق, ایک ادبی نقاد کے علاوہ ایک فلم (Beyond the Seven Seas-1991) کے سکرین رائٹر اور ڈائریکٹر سعید انجم تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے ایک مایہ ناز طالب علم تھے۔ افسانہ نویسی میں گرفت مضبوط اور اسلوب منفرد ہونے کے باعث ادبی حلقوں میں ایک خاص مقام اور پہچان رکھتے تھے۔ آپ پاکستان سے ہجرت کر کے ناروے میں آباد ہوئے اور وہیں پر وفات پائی۔ المنار کے زیرِ نظر شمارہ میں آپ کے دو افسانے شاملِ اشاعت ہیں۔
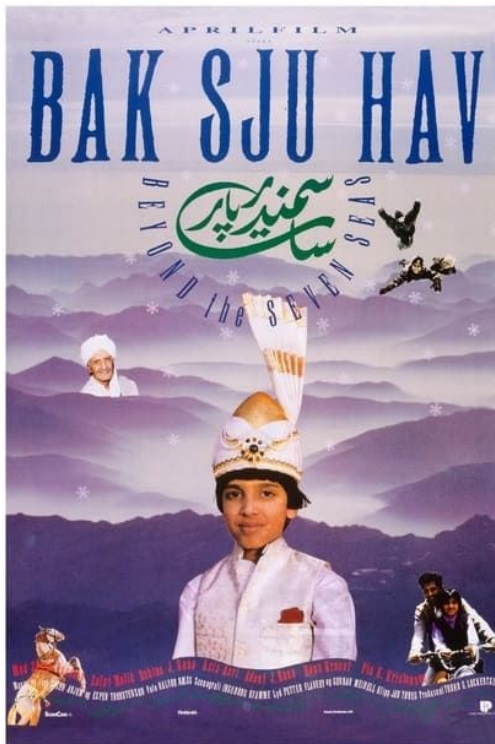
محمد خالد، سعید اکبر اور ابرار احمد

مجید طاہر، کرم خالد، سعید اکبر، سفیر رامے، انوار احمد اور امیر پیر کوٹی

صاحبزادہ فہیم، سعید اکبر اور سفیر رامے

سعید انجم

دھوپ کی وسعت

بادلوں سے باہر نکلتے ہی ہوائی جہاز کو نرم دھوپ کی وسعت نے گرفت میں لے لیا۔ لندن کا مٹیالا منظر کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ جہاز کے اندرونی منظر میں جو رنگ دھند اور بارش کی وجہ سے پھیکے معلوم ہو رہے تھے اب اپنی شوخی کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ نیچے سفید روئی کا پھیلا پھولا فرش تھا اور اوپر نیلگوں پھیلاؤ لئے آسمانی سائبان۔ فضائی میزبانوں کو متحرک دیکھ کر مسافروں نے اپنی فولڈ میزیں کھول لیں۔ خاطر تواضع کی ٹرالی ابھی دور تھی۔ شاکر نے سلیمہ کا خط نکال لیا۔

آپ اوسلو آ جائیں۔ اس کاغذ کے اوپر بائیں کونے میں لکھے ہوئے نمبر پر آپ ٹریول ایجینٹ کو فون کریں۔ پہلے اپنا نام بتائیں پھر ہماری فرم کا ''ساجد ٹریڈرز''۔ جس دن کی جو فلائیٹ سوٹ کرتی ہو آپ ان کو بتا دیں۔ ٹکٹ آپ تک پہنچ جائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ خرچہ صرف آنے جانے کا اخراجات کا نہیں ہوتا۔ وقت بھی ایک سرمایہ ہے لیکن اس کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے؟۔۔۔ اللہ کے نام پر اپنے دوست کے پریشان خاندان کی مدد کریں۔ آپ کے ایک آدھ ایک۔۔۔ قربانی سے ہمارے گھر کو نئی زندگی مل جائے گی۔ یہاں کے مسائل کا اندازہ آپ کو ان کاغذات سے ہو جائے گا جو اس خط کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ یہ سب کچھ ساجد نے لکھا ہے۔ فوٹو سٹیٹ کاپیاں میں نے بنائی ہیں۔ ان کو آپ ضرور پڑھ لیں۔

مجھے پاکستانی سٹائل کا عشق ہو گیا ہے۔ ساجد نے لکھا تھا۔ بیس سال کے بعد میں اس عفریت کے قابو میں آیا ہوں۔ لاہور میں جب مجھے عشق ہوتا تو تصور میں ایک مکالمہ جاری ہو جاتا۔ دوست احباب اسے میری خود کلامی کا زمانہ بیان کرتے۔ تنہائی میسر آتے ہی میں خطوط لکھنے شروع کر دیتا لیکن انہیں مکمل نہیں کر پاتا۔ ملاقات کے پروگرام بناتا اور ملتوی کر دیتا۔ خامیاں منصوبہ بندی میں رہ جاتیں اور الزام میں حالات کے جبر پر عائد کر دیتا۔ میں خوش رہنے کی کوشش میں اداس رہتا۔

ایسے زمانے میں ٹائم کلنگ کا میں بادشاہ ہوتا۔ مصروفیات ہاتھ باندھے میری منتظر رہتیں اور میں عشق کے تصور میں گم۔ آہستہ آہستہ روزمرہ زندگی کا نظام بگڑنے لگتا۔ قرض بڑھ جاتا' نیند اُڑ جاتی اور سرور کی ضرورت بڑھ جاتی۔ چسکے اور سواد کی لپیٹ میں رہنا مجھے اچھا لگتا۔ نبض کی رفتار تیز ہو جاتی۔ کسی بیماری کے جراثیم پیش قدمی شروع کر دیتے۔ بس یہی وہ دور ہوتا جب کسی کھڑکی سے ہوا کا ایک آدھ جھونکا چلا آتا۔ کوئی آئینہ بے نقاب ہو جاتا۔ میری بصارت مجھے واپس مل جاتی اور میرا تصور کینچلی بدل لیتا۔ خود کلامی کا زمانہ ختم ہو جاتا اور نبض کی رفتار نارمل ہو جاتی۔

اوسلو پہنچ کر معلوم ہوا کہ عشق کسی سحر کا نام نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ بدن چونکہ مستور نہیں اس لیے محبت کرنا تصور تک محدود نہیں۔ ناروے کی گلیوں اور بازاروں میں جسم ایک دوسرے کو کھلی باہوں سے اپناتے نظر آئے۔ استقبالی معانقے اور الوداعی بوسے صرف ہوائی اڈّے اور ریلوے سٹیشن تک محدود نہیں تھے۔ کلب' کیفے اور فٹ پاتھ تک پر جدائی اور ملاپ کے مناظر عام تھے۔ لڑکیوں کے گلے میں دل کی شکل کے لاکٹ نظر آتے اور لڑکوں کے لب سچ مچ کے مکالمے میں مصروف۔ یہ مکالمہ جنس مخالف کے لبوں میں مدغم ہو کر جاری ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا خود کلامی کی عادت کسی کو نہیں رہ گئی۔

"پینے کے لئے آپ کیا پسند کریں گے؟" مسکراتی ائیر ہوسٹس نے ٹرالی روک کر پوچھا۔

"ریڈ وائن!" اوسلو کے برفانی موسم نے تقاضہ کیا۔

"بہت بہتر!" فرمائش پوری کرنے کے بعد ٹرالی آگے بڑھ گئی۔

ان دنوں میں گیند کی طرح ٹپّے کھا رہا ہوں۔ ساجد نے دوسرے کاغذ پر لکھا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ گیند کی حرکت عمودی ہوتی ہے اور میرا اہلنا جلنا افقی۔ گیند زمین سے دور و نزدیک ہوتی رہتی ہے اور میں انسانوں سے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کسی کے قریب کیوں ہوتا ہوں اور دور ہونے کی وجوہات کیا ہوتی ہیں۔ زندگی میں یہ ایک نئی صورت حال ہے۔ لاہور میں ہوتا تو کسی یار دوست سے ڈسکس کر لیتا۔ یہاں پر تو کوئی یار دوست بھی نہیں ہے۔ کئی دفعہ کوشش کی کہ اپنا مسئلہ خط میں لکھ بھیجوں۔ شاید کوئی مشورہ مل جائے لیکن یہاں پر تنہائی میسر ہونے کے باوجود خط نہیں لکھا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے سارے رابطے کمزور ہو گئے ہیں۔ بچپن میں انگلیوں کے پٹاخے نکالنا بہت اچھا لگتا تھا۔ بزرگ کہتے تھے ایسا کرنے سے جوڑ کمزور ہو جاتے ہیں۔ پردیس کی زندگی میں پٹاخہ سنائی بھی نہیں دیتا اور انسان کے جوڑ کمزور ہو جاتے ہیں۔

زاہدہ کے لئے ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کے لئے ملنا اور بچھڑ جانا زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ زندگی اور موت کو بھی وہ

اسی تناظر میں دیکھتی ہے۔ پیدائش کے موقع پر منائی جانے والی خوشی اور مرگ کے سوگ کو وہ حقیقی جذبات کا اظہار کہتی ہے۔ سچے دل سے ملنے اور بچھڑ جانے والں کو دیکھ کر اسے بہت تسکین ملتی ہے۔ جب کبھی اداس ہوتی ہے تو وہ ایئرورٹ پر چلی جاتی ہے۔ آمد یا روانگی کے لئے مخصوص حصے میں پہنچ کر آنے یا جانے والے مسافروں کو دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی بچھڑنے والوں کو دیکھ کر آنسو بہاتی ہے تو کبھی مل جانے والوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔

''کھانا!'' فضائی مہربان ٹرے اٹھائے بغل میں کھڑی تھی۔

شاکر نے کاغذات سمیٹ کر کھانے کی ٹرے کے لیے جگہ بنائی۔

بن، پنیر، مکھن، سلاد، بیف اور سبزی کی خوشبو اشتہار انگیز تھی۔

کیک کھانے کی باری آئی تو فضائی میزبان پھر بغل میں کھڑی تھی، ''چائے یا کافی۔''

کھانے پینے سے فارغ ہو کر جب مسافر اپنے سامنے کی میزیں فولڈ کرنے لگے تو شاکر نے ساجد کا لکھا ہوا آخری کاغذ نکال لیا۔ اس نے لکھا تھا۔ دوستیاں پودوں کی مانند ہوتی ہیں۔ انہیں پالنا پوسنا پڑتا ہے۔ ان کے لئے کھاد اور پانی کا بندوبست کرنا ہوتا ہے۔ جب سے مجھے یہ بات سمجھ میں آئی ہے میں ذرا متحرک ہو گیا ہوں۔ جن لوگوں سے مل کر مجھے خوشی ہوتی ہے ان کے سگنلز کے لئے میں اپنے ''اینٹینے' سے پوچھ گچھ کرتا رہتا ہوں۔ ہماری بعض رگیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر باقائدگی سے ان کی مالش نہ کی جائے تو وہ صحیح طور پر کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔

''کیا میری ساری رگیں صحیح طور پر کام کرتی ہیں؟'' سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے شاکر نے سوچا۔

غنودگی کا غلبہ ہونے لگا تو شاکر نے آنکھیں بند کر لیں۔ سامنے گھپ اندھیرا تھا اور اطراف میں ڈراؤنی آوازیں۔ اس کا بدن ایک سوکھے پتے کی طرح ان دیکھی ہواؤں کے زور سے ایک انجانی سمت میں بہت تیز فتاری کے ساتھ ارتا چلا جا رہا تھا۔ دور ایک ٹمٹماتا ہوا ستارہ نظر آیا جو لمحہ بہ لمحہ قریب ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے ساتھ ایک کہکشاں بھی نمایاں ہونے لگی۔ پھر ستارہ ایک جگہ پر ساکت ہو گیا۔ ٹمٹمانے کی بجائے اب وہ راستہ دکھا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اپنی سمت کا تعین کیا جا سکتا تھا۔ وہ قطبی ستارہ تھا۔ اس کے نقش اب واضح ہو رہے تھے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اب صاف نظر آنے لگا تھا۔ شاکر نے اسے پہچان لیا۔ کہکشاں کے ساتھ ساجد کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کاغذ تھے۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا وہ کسی مشاعرے میں اپنا کلام سنا رہا ہے۔ ڈراؤنی آوازیں پیدا کرنے والے دم دار ستارے گردش کرتے ہوئے اب کہیں دور جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ کہکشاں نے اب ایک واضح دودھیا راستے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ساری فضا ایک سٹیڈیم کی تھی جو روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ لاتعداد لوگوں سے بھرا ہوا۔ سب داد دے رہے تھے۔ یکدم ایک سیٹی بجی۔ سب لوگ سہم گئے۔ فضا میں بڑبڑاہٹ کی آوازیں رہ گئیں۔ آہستہ آہستہ وہ بھی معدوم ہو گئیں۔ مکمل خاموشی نے شاکر کے حواس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ٹن کی گونج کے ساتھ ہی ہدایات کی بتیاں جل اٹھیں۔

سب مسافروں نے اپنی اپنی پیٹیاں سنبھال لیں اور ٹک، ٹکاٹک کی آوازیں پورے جہاز میں پھیل گئیں۔ لینڈنگ سے پہلے سمیٹی جانے والی چیزوں کو سنبھالنے کے لئے فضائی میزبانوں کی رفتار میں تیزی سی آگئی۔

اوسلو ایرپورٹ پر امیگریشن کاؤنٹر پار کر کے شاکر باہر نکلا تو اُسے سلیمہ نظر آگئی۔ وہ اکیلی کھڑی تھی۔

" آپ کے مجازی خدا؟" شاکر نے پوچھا۔

"اپنی دیوی کے ہاں!" سلیمہ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی کڑواہٹ تھی۔

"ساجد کو میرے آنے کی خبر ہے؟"

"بالکل ہے!"

"کہاں ہے۔" شاکر بڑبڑایا۔ "تمہیں اکیلے آنا پڑا۔

" میں اکیلی اب بہت کچھ کر لیتی ہوں۔" مسکراتے ہوئے بولی۔

ائیرپورٹ سے گھر تک کے منظر نے شاکر کو ٹھٹھرا دیا۔ کار کے اندر خنکی نہیں تھی لیکن باہر سب کچھ برف پوش تھا۔ سڑک، فٹ پاتھ اور چھتیں۔ تھوڑے بہت لوگ جو اسے نظر آئے وہ سبھی کچھ ایسا لباس پہنے تھے گویا خلاباز ہوں۔ بھاری جوتے' موٹی جیکٹیں' اونی ٹوپیاں اور گرم مفلر۔ خود کو گرم رکھنے کے لئے معلوم ہوتا تھا سب نے پیٹ میں آگ جلا رکھی ہے۔ ہر ایک کے منہ سے دھواں نکلتا تھا۔

گھر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ڈرائینگ روم کا آتش دان روشن کیا جارہا تھا۔ کھٹکا سن کر ساجد نے مڑ کر دیکھا۔ شاکر کو دیکھ کر وہ آگے بڑھا تو دونوں بغلگیر ہو گئے۔

"کیوں شہزادے؟" شاکر بولا "ائیرپورٹ پر کیوں نہیں آئے۔

"میں نے سوچا۔۔" معمولی وقفے کے بعد ساجد نے کہا "مہمان کو میزبان ہی گھر لائے تو بہتر ہے۔"

"نہیں!" ساجد کی آنکھوں میں شرارت چمکی "میں تمہارا دوست ہوں۔ بس!"

شام کے کھانے کے بعد گھر کے دونوں بچے اپنی اپنی مصروفیات کے سلسلہ میں گھر سے باہر چلے گئے۔ بیٹے کو باسکٹ بال کھیلنا تھا اور بیٹی کو وائلن کی مشق کے لئے جانا تھا۔ شاکر اور ساجد ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تو سلیمہ نے میز پر خشک میوے سجا دیئے۔

"تمہارے لندن پہنچنے کا سن کر سلیمہ تو بے چین ہو گئی تھی۔" ساجد نے بتایا "مجھے کہنے لگی تمہارے بچپن کا دوست ہے۔ اسے ناروے بلاؤ۔"

"پھر بلایا کیوں نہیں تم نے؟" شاکر نے پوچھا۔

" مجھے معلوم تھا کہ یہ خود تمہیں بلالے گی۔" ساجد نے بتایا۔

"اچھا تو تبھی تم نے نامکمل خطوط لکھنے شروع کر دیے؟"

"کیا مطلب؟؟" کئی رنگ ساجد کے چہرے پر آکر گزر گئے۔

" نامعلوم مخاطب کے نام لکھے تمہارے رقعوں کی فوٹو کاپیاں سلیمہ نے مجھے بھیج دی تھیں۔" شاکر نے اپنی جیب سے کاغذات باہر نکال لئے۔

زہریلی آنکھوں سے ساجد نے سلیمہ کی طرف دیکھا۔

" تم نے لکھا تھا: مصروفیات ہاتھ باندھے میری منتظر رہتیں اور میں عشق کے تصور میں گم۔" شاکر نے اسے یاد دلایا۔

"۔۔۔روزمرہ زندگی کا نظام بگڑنے لگتا اور قرض بڑھ جاتا۔۔۔جو کچھ میں نے لکھا تھا۔ مجھے سب یاد ہے" ساجد غصے سے بولا "۔۔۔ نیند اڑ جاتی اور سرور کی ضرورت بڑھ جاتی۔ لیکن یہ سب لاہور میں ہوتا تھا اور ہو سکتا تھا۔" پھر چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے اس نے کہا۔"تب میں کنوارہ تھا' اب دو بچوں کا باپ ہوں جو لگ بھگ بالغ ہیں۔ میرے کاروبار کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ ہر کام کو اپنے وقت پر نپٹانا چاہا ہے۔ پھر یہ خود بھی تو ہے۔ اگر میں کوئی کام بھول جاؤں تو یہ کر دیتی ہے۔ کاروبار میں برابر کی حصہ دار ہے یہ۔ اس سے پوچھو کہ میں نے کب اور کہاں غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا؟"

"بھئی بیوی ہے۔" شاکر ایک گداز لہجے میں بولا "خاوند کے عشق سے پریشان تو ہو گی۔"

"میں اپنے خاندان کو بچانا چاہتی ہوں" اب سلیمہ بھی بولی۔

"خاندان کو کیا خطرہ ہے؟" ہکّے بکّے ساجد نے سلیمہ کی طرف دیکھا۔

"زاہدہ!" سلیمہ پورے دم خم سے بولی۔

" بعض اوقات تم حد کر دیتی ہو سلیمہ۔" خود کلامی کے انداز میں ساجد نے کہا۔

"یہ زاہدہ کون ہے؟" شاکر نے پوچھا۔

"میری سکرٹری ہے یار!" کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے ساجد نے بتایا۔

"یعنی سارا دن تمہارے ساتھ رہتی ہے؟" شاکر نے پوچھا۔

"نہیں!" ساجد بولا "وہ سارا دن ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ سلیمہ اور میں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے ہیں۔"

پھر بچے گھر آ گئے۔

شاکر کے لئے وہ بچے عجیب بچے تھے۔ انہوں نے اپنے دادا' دادی کے کسی قصے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ اپنے باپ کے بچپن کا کوئی واقعہ ان کی آنکھوں میں چمک نہ پیدا کر سکا۔ شاکر نے سوچا کہ بچوں کو اس کی زبان سمجھنے میں دشواری ہو سکتی ہے چنانچہ اس نے چاہا کہ وہی کوئی بات سنائیں۔ ایسی بات جس پر انہیں فخر ہو۔ کوئی ایسا واقعہ جو ان کے لئے غیر معمولی ہو لیکن ان کا رویہ کم وولٹیج کے بلب کا ہی رہا۔ ان کے دل و دماغ کی پوری کارگردگی شاکر کو نظر نہ آ سکی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بچوں کو اپنے والدین کے وطن یا ہم وطن سے کوئی دلچسپی نہیں۔

شاکر نے چاہا کہ بچے اپنے وطن یا ہم وطنوں کے بارے میں ہی اسے کچھ بتائیں لیکن اس باب میں بھی ان کا رویہ ٹھنڈا رہا۔ سلیمہ کا خیال تھا کہ دن بھر کی مصروفیت نے بچوں کو بس تھکا دیا تھا ورنہ بجھے ہوئے وہ نہیں تھے۔

''زاہدہ کی ایک بات کا میں بہت مداح ہوں۔'' ناشتے کے بعد ساجد نے بتایا۔ ''وہ کھل کر ہنس لیتی ہے اور جی بھر کر رو لیتی ہے۔''

''اس بات کو کون خوبی سمجھے گا؟'' شاکر کی طرف دیکھتے ہوئے سلیمہ نے پوچھا۔

'' ہر وہ فرد جو کھل کر رونے اور ہنسنے کی افادیت سے آگاہ ہو گا۔'' ساجد نے کہا' '' مجھے کھل کر ہنسے معلوم نہیں کتنے سال ہو گئے ہیں؟۔۔رونے رلانے کا شعبہ تو تمہارے پاس ہوتا تھا سلیمہ۔۔'' ساجد نے اس کی طرف دیکھا ''ذرا ٹھیک ٹھیک بتانا کہ سچ مچ روئے ہوئے تمھیں کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

''میں کیوں رووٴں گی؟'' سر اٹھا کر سلیمہ نے جواب دیا۔

''میرے لئے تو ممکن نہیں کہ کہہ دوں۔۔۔میں کیوں' ہنسوں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' شاکر نے پوچھا۔

''صرف یہ کہ ہنسنے رونے کا انحصار بھی ایک سرمائے پر ہوتا ہے۔ محبت کے سرمائے میں اضافہ ہو جائے تو ہم ہنستے ہیں اور کم ہو جانے پر ہم روتے ہیں۔'' ساجد نے وضاحت کی۔

''بات کچھ واضح نہیں ہو سکی۔'' شاکر نے بتایا۔

''میرے اور سلیمہ کے پاس اب کاروبار کے کھاتے رہ گئے ہیں۔ محبت کے اکاوٴنٹ بند ہو چکے ہیں۔'' ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ساجد نے کہا۔ ''تمہارے پاس کریڈٹ کارڈ ہو گا۔ کسی بھی کاوٴنٹر پر دو۔۔۔ادائیگی ہو جائے گی۔ جانتے ہو کیوں؟'' ساجد نے پوچھا۔

''کیوں؟'' شاکر نے کہا۔

''وہ اس لئے کہ متعلقہ کارندے کو خبر ہے کہ کریڈٹ کارڈ ایک سرمائے کا ٹوکن ہے۔ ادائیگی کا زر تبادلہ قابل حصول ہے۔ کھل کر رونا ہنسنا انہیں کو میسر ہے جن کے پاس جذبات کا کریڈٹ کارڈ ہے۔ ان کی محبت کے سرمائے میں اضافہ ہو جائے تو وہ ہنس لیتے ہیں۔ اگر کمی ہو جائے تو رو لیتے ہیں۔'' ساجد نے وضاحت کی۔

''تمہارا مطلب ہے۔۔۔'' سلیمہ نے ساجد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا' ''زاہدہ کے پاس محبت کا سرمایہ موجود ہے؟''

''یقیناً!'' ساجد اٹھتے ہوئے بولا ''آج ہفتے کا دن ہے۔ پروگرام کے مطابق مجھے بچوں کو شاپنگ کرانی ہے۔ تم دونوں زاہدہ کا یہ نامکمل خط پڑھ لو۔'' اس نے بٹوے سے ایک کاغذ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا ''ہو سکتا ہے میری دلچسپی کی وجہ تم سمجھ جاوٴ۔ مخاطب اس کا بھی نامعلوم ہے۔''

زاہدہ نے لکھا تھا: ٹورسٹ اور پرندے ناروے سے جا چکے ہیں۔ پرندے دانے پانی کے لئے گرم ساحلوں اور سرسبز کھیتوں کی

طرف پرواز کر گئے ہیں تو ٹورسٹوں کی چھٹیاں اور ٹریولر چیک ختم ہو گئے ہیں۔ کاش میں بھی پرندہ ہوتی یا ٹورسٹ۔

گئے سالوں کی طرح اس برس بھی نارویجن درختوں کے پتے دنوں میں زرد ہوئے اور ہفتہ بھر میں سڑکوں پر بکھر گئے۔ ایک روز تیز ہوا گھرے بادل لائی تو بارش شروع ہو گئی۔ پھر درجہ حرارت گرنے لگا۔ پہلی برف باری نے اوسلو کو سردیوں کا گیٹ اپ دے دیا۔ گلیاں' بازار' مکان اور دوکانوں کی چھتیں' ٹیلے اور پہاڑ سبھی کچھ برف سے ڈھک گیا۔ میں نے بند گلے کی بھاری جیکٹ پہن کی کانوں کے گرد اونی مفلر لپیٹ لیا ہے۔ موٹی دستانوں سے ہاتھوں اور گرم ٹوپی سے سر کو ڈھانپ لیا ہے۔ دن سکڑ گئے ہیں۔ اجالے میں کمی ہو گئی ہے۔ انسانوں کے منہ سے نکلنے والی بھاپ' سردیوں کی کہر اور بادلوں کے علاف نے شہر کی روشنیوں کو دھندلا کر دیا ہے۔ منظر پھیکے پڑ گئے ہیں اور راتیں طویل ہو گئی ہیں۔

بڑھتی ہوئی سردی کے اس منظر سے انسان تقریباً غائب ہو گئے ہیں۔ برف کی تہوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ کھانے کے علاوہ مچھلی کا تیل اور سبزیوں کا سوپ بھی باقائدگی سے پی رہی ہوں لیکن حرارت کے لئے کچھ اور بھی چاہیے۔ باہر کی ٹھنڈ کا مقابلہ کرنے کے لیے۔ ۔۔۔"

تینوں وہاں پہنچے تو زاہدہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ زارو قطار روتی رہی ہے۔

"کیا ہوا؟" ساجد نے پوچھا۔

زاہدہ نے ایک کاغذ لہرایا۔

"ایک نامکمل خط؟" خط تھامتے ہوئے ساجد بولا۔

"کس نے لکھا ہے؟" سلیمہ نے پوچھا۔

"میری ماں نے۔" زاہدہ نے جواب دیا۔ "جب سے میں یہاں آئی ہوں وہ پاکستان میں اکیلی رہ گئی ہے۔ اس کی تنہائی نامکمل خطوط بانٹتے ہیں۔ کبھی کبھار ہماری ہمسائی ایک آدھ تحریر مجھے بھیج دیتی ہے۔"

پوری پوری رات جاگتی ہوں۔ زاہدہ کی ماں نے لکھا تھا۔ آنکھیں بند کروں تو ٹک ٹک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ معلوم نہیں ہو پاتا دل دھڑکتا ہے کہ گھڑی چلتی ہے۔ کبھی کبھار تو میں اٹھ کر غسل خانے میں جھانکتی ہوں۔ شاید پانی کی ٹوٹنی ڈھیلی رہ گئی ہو اور ٹپ ٹپ کی آواز جست کی خالی بالتی میں ٹپکتے قطروں کی وجہ سے ہو۔ آنکھیں بند ہوں تو ٹک ٹک اور ٹپ ٹپ کے فرق کا کیا پتہ چلتا ہے؟ آنکھیں کھولتی ہوں تو رات کی خاموشی کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے حواس میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ آنکھوں سے میں سنتی ہوں اور کانوں سے میں دیکھتی ہوں۔ لیکن ایسا صرف رات کے وقت ہوتا ہے۔ دن میں حواس ٹھیک کام کرتے ہیں۔ دائیں بائیں کی خوشبو کا پتہ چلا ہے۔ پاس پڑوس کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ زبان ذائقے کی گواہی دیتی ہے۔ آئینے میں سراپا دکھائی دیتا ہے۔ ہاتھ سردی گرمی کے بھید بھاؤ سے آگاہ رکھتے ہیں۔ معلوم نہیں زاہدہ کے دن رات کیسے گزرتے ہیں۔

سلیمہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"دیکھا تم نے؟" ساجد نے کہا "زاہدہ کے پاس محبت کا سرمایہ موجود ہے۔ اس کی ماں اس کا سرمایہ ہے۔"

"۔سب کے لئے ماں ایک سرمایہ ہے۔" شاکر نے کہا۔

"محبت ایک سرمایہ ہے۔" ساجد زور دے کر بولا۔ "پردیس کی زندگی نے ہماری محبت کے جوڑ کمزور کر دیے ہیں۔ رشتوں کے پٹاخے اب بھیگ چکے ہیں۔ تم وطن میں رہتے ہو۔ تمہارے جذبوں کا بارود ابھی سلامت ہے۔"

"تمہارے الفاظ میرے لیے قطبی ستارے کی طرح چمکتے رہیں گے۔" شاکر نے کہا۔

"چلیں؟" سلیمہ نے پوچھا۔

"چلو" ساجد نے جواب دیا۔

"دیکھو! ساجد عجیب آدمی ہے۔" ائیرپورٹ پر سلیمہ نے کہا" نہ تو تمہیں لینے آیا تھا اور نہ اب چھوڑنے کے لیے۔"

"میرا خیال ہے اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔" سلیمہ کے ہاتھ تھامتے ہوئے شاکر بولا۔ "وہ ہمیں وقت دینا چاہتا تھا"

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔ اسے۔۔۔"

"اسے ہمیشہ سے پتہ تھا سلیمہ" شاکر نے اس کی بات کاٹی۔

برف کی مانند ٹھنڈی سلیمہ کی نظریں شاکر کی آنکھوں میں جم کر رہ گئیں۔

"کالج کے زمانے میں تم کہا کرتی تھیں۔۔" شاکر بولا" جب کبھی میرے بس میں ہوا' اپنے بھدے اور کھردرے ہاتھوں کو بدل ڈالوں گی۔۔۔ یاد ہے؟"

سلیمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ساجد نے ان کو بدل ڈالا ہے۔" کہتے ہوئے شاکر روانگی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

فضا میں چڑھتے اترتے جہازوں کا شور رچا ہوا تھا۔۔۔

نیک بندوں کا زیور

سعید انجم

اس میں رونے کی کیا بات؟

تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اتنے سالوں کے بعد اللہ میاں نے مجھے توفیق دی ہے کہ میں پاک سرزمین کے نیاز حاصل کر سکوں۔ وہاں پر دیار کفر کی طرح کا حلال حرام والا چکر تو ہو گا نہیں۔ وہ اسلام کا قلعہ ہے۔ وہاں پر جو کچھ بھی میں کھاؤں گا اس میں برکت ہو گی۔ تم تیار رہو، اگلی مرتبہ ہم اکٹھے چلیں گے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب بچوں کے سکول بند ہوں گے۔ چودہ اگست ہم وہیں منائیں گے۔ سبز پرچم کی چھاؤں میں۔ ہو سکتا ہے وہاں پر اللہ کے کسی ایسے نیک بندے سے ملاقات ہو جائے جو فرشتہ ثابت ہو۔ آخر فرشتوں نے کسی روپ ہی میں ملنا ہوتا ہے۔ تم دعا کرنا۔ بندوں کی دعائیں قبول ہو جائیں تو اللہ فرشتوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہے کہ وہ ان کے اٹکے ہوئے کام ٹھیک کر کے آئیں۔ تم آنسو پونچھو اور بچوں کے سر پر اپنا ہاتھ رکھو۔ مجھے اب جانا ہے ورنہ دیر ہو جائے گی۔

O

اچھا تو آپ جرنلسٹ ہیں؟ ویری انٹرسٹنگ!

آپ مرد مومن کی تلاش میں پاکستان جا رہے ہیں؟ ہاؤ ایکسائٹنگ!

ہمارے ہاں تو آپ کو یہ جنس کثرت سے مل جائے گی۔ یونیفارم میں بھی اور سویلین کپڑوں میں بھی۔ مرد مومن کو تلاش کرنے کے لیے کسی خاص نمبر کی عینک لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ننگی آنکھوں سے بھی یہ مخلوق صاف نظر آتی ہے۔ جب سے سرکار کو معلوم ہوا ہے کہ مرد مومن کی شہرت ملک کی سرحدیں پار کر چکی ہے۔ اس نے کوشش کی ہے کہ ان کو بڑے بڑے شہروں میں اکٹھا کر لیا جائے۔ شاید آپ ہی جیسے ضرورت مندوں کی آسانی کے لیے ان کو فائیو سٹار ہوٹلوں کے ماحول میں ہی ایڈجسٹ کر لیا گیا ہے۔ ایک مثال حاجی لطیف کی ہے۔ وہ ایک سیدھا سا کسان تھا۔ پانچ وقت کا نمازی۔ اس کی زمین جبری نیلامی میں آ گئی تو ملک صاحب نے خرید لی۔ پہلے لطیف کو حج کرایا پھر اپنے ہوٹل ہی میں اسے کام دے دیا۔ اب وہ لفٹ آپریٹر ہے۔ ہر وقت باوضو رہتا ہے۔ ولائتی اخبار نویسوں کو انٹرویو دینے کے لیے تیار۔ اس کے ساتھ بس ایک پرابلم ہے۔ اسے یورپ کی کوئی زبان نہیں آتی۔ وہ ولائتی زبانوں کو سامراجی زبانیں کہتا ہے۔ چنانچہ ملک صاحب

ترجمان کا بندبست کر دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ٹرانسلیٹروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ملک صاحب نے سب کو اپنی زبان سکھا دی ہے۔ آپ کے لیے کوئی بھی یہ کام کر دے گا۔ اچھا اس سے پہلے کہ ایئر ہوسٹس ہمیں کسی کام میں مصروف کر دے۔ آپ ایک بات تو مجھے بتا دیں۔ یہ مرد مومن میں آپ کی دلچسپی کی اصل وجہ کیا ہے؟

O

معاف کیجئے' میں نے سنا نہیں۔ کیا کہا آپ نے؟ سچی بات تو یہ ہے کہ سوائے ٹیپ ریکارڈر کے سب کچھ سنتا بھی کوئی نہیں۔ ہم حرف وہی کچھ سنتے ہیں جو ہم سننا چاہتے ہیں۔ ورنہ ہم اپنے کان بند رکھتے ہیں۔ سب آوازیں ایک فلٹر میں سے گزرتی ہیں۔ فلٹر کے معیار کا پیمانہ شخصی اور ذاتی ہوتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر ہم متحرک ہوتے ہیں اور میسج میں سے اپنا شیئر تلاش کرتے ہیں۔ شیئر زہی تو پر افٹ دیتے ہیں۔ ہاں آپ ٹھیک سمجھے۔ ایک سٹاک ایکسچینج ہمارے اندر بھی ہوتا ہے جو مسلسل مصروف رہتا ہے۔ دوسروں کے بھاؤ وہاں بھی چڑھتے اترتے رہتے ہیں۔ اصطلاحات مختلف ہوتی ہیں لیکن بولی باقاعدہ لگتی ہے۔ خرید و فروخت ہوتی ہے۔ زندگی دراصل ہر وقت سپورٹس کار کی طرح ہائی وے پر نہیں دوڑتی۔ اپس اینڈ ڈاؤنز آتے رہتے ہیں۔ اس کی وجوہات تو کئی ہیں لیکن ایک فیکٹر ڈالر کا بھاؤ بھی ہے۔ ڈالر جو دیتا ہے سو دیتا ہے۔ لیکن یہ کچھ نہ کچھ واپس بھی لیتا ہے۔ اس لینے دینے کو سب لوگ نہیں سمجھتے۔ سمجھیں بھی کیسے؟ پڑھے لکھے لوگ زیادہ سے زیادہ واشنگٹن پوسٹ یا نیویارک ٹائمز تک پہنچتے ہیں۔ وال سٹریٹ جرنل اور فنانشل ٹائمز ابھی تک سی این این کی خبروں کی طرح ہر بلیٹن کا حصہ نہیں بن سکے کہ باقی دنیا کی کرنسیوں کے اتار چڑھاؤ کی خبر رہے۔ اب اعداد و شمار نے کلیدی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ یہ ٹیکنالوجی آف ڈیجیٹل پروڈکٹس کا دور ہے۔ نمبر نمبر نمبر!!!ہندسہ ہندسہ ہندسہ!!!

O

نہیں صاحب جی' نہیں۔ یہ میری مرضی نہیں تھی۔ میں نے ہرا پاسپورٹ اپنی مرضی سے نہیں بدلا۔ یہ دیکھیں میرا رومال۔ میں اپنی جیب میں ہمیشہ سبز رومال رکھتا ہوں۔ آپ کبھی میرے گھر آکر دیکھیں۔ وہاں پر سارے پردے ہرے رنگ کے ہیں۔ بیس سال تک میرے پاس سبز پاسپورٹ رہا ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہو گا کہ صرف پانچ سال کے بعد میں پاسپورٹ بدلنے کی عرضی دے سکتا تھا۔ پر صاحب جی میں نے عرضی دی نہیں۔ اب اتنے سالوں کے بعد اگر میرے پاسپورٹ کی کاپی بدل گئی ہے تو کیا ہوا۔ اس پر چڑھایہ کور دیکھیں۔ ہرے رنگ کا یہ کور میں نے آرڈر بھیج کر منگوایا تھا۔ ترجمان کی مدد سے میں نے یہ آرڈر بھیجا تھا۔ پی آئی اے پر سفر کرنا مجھے اسی لیے پسند ہے کہ بندے کو ترجمان کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں کوئی پہنچ والا بندہ نہیں ہوں صاحب۔۔۔ پر حاجی لطیف کا بھائی ہوں۔ وہ بڑی پہنچ والی جگہ پر کام کرتا ہے۔ آپ اب مجھے اور نہ روکیں۔ ٹھپہ لگائیں اور مجھے جانے دیں۔ جب سے ڈالر اکاؤنٹ کا رواج ہوا ہے میں نے نقد ڈالر جیب میں لانے چھوڑ دیئے ہیں۔ میں جاؤں صاحب جی؟

O

حاجی لطیف لفٹ آپریٹر نے ڈیوٹی شروع ہی کی تھی کہ دو گورے احرام باندھے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر انہوں نے کوئی بات کی اور لفٹ کی طرف پڑھے۔ دروازہ بند ہوتے ہی ایک گورے نے کلاشنکوف نکال لی۔ حاجی لطیف نے سوچا کہ آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کلمہ پڑھا۔ کلمہ ختم ہو گیا فائر نہیں ہوا۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا تو دوسرا گورا اپنے لبادے کے نیچے سے فنانشیل ٹائمز کا تازہ اخبار نکال رہا تھا۔

"لاؤ!" کلاشکوف والا چلایا۔

ڈر کے مارے حاجی لطیف کی دوسری آنکھ بھی کھل گئی۔ فنانشیل ٹائمز اور کلاشنکوف اب نظر نہیں آ رہی تھی۔ لفٹ ساتویں منزل پر کھڑی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی اینگلو امریکن اخبار نویسوں کے ایک ہجوم نے دونوں مسافروں کو گھیر لیا۔

"کابل کتنی دور رہ گیا ہے؟" ان گنت فلیش لائیٹس چمکیں۔

" جلال آباد میں کیا ہو رہا ہے؟" بے شمار کیمروں نے سوال کیا۔

حاجی لطیف ابھی اس بات پر غور ہی کر رہا تھا کہ اس نے افغان مجاہدین کو گورے کیسے سمجھ لیا حالانکہ انہوں نے پشاوری چپل بھی پہنے ہوئے تھے کہ ایک نیا مسافر لفٹ میں داخل ہوا۔ وہ نیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "گراؤنڈ فلور"۔ دروازہ بند ہوتے ہی اس نے اپنے چہرے پر نقاب اوڑھ لی اور کچھ اس طرح کا پوز بتایا گویا وہ کلاشنکوف کے ساتھ فائر کر رہا ہو۔ حاجی لطیف منہ ہی منہ میں لاحول پڑھنے لگا۔

O

کاؤبوائے نے پستول نکالا اور گولی چلا دی۔

دھماکے کی آواز سن کر اسلام آباد کے طوطے اڑ گئے۔

" سالا!۔۔۔ سلام تک نہیں کرتا۔" کاؤبوائے نے پستول کی نالی میں پھونک ماری۔ پھر گرد و نواح کے لوگوں کو اپنے گرد جمع ہوتے دیکھ کر بولا" ہر مسلمان کا فرض ہے کہ سلام کرنے میں پہل کرے۔"

"بے شک! بے شک!" قریبی منڈیر سے ایک پالتو پرندہ بولا۔

کیڈلک روانہ ہوئی تو فیصل مسجد کے میناروں سے اذان کی آواز گونجی۔

" ساعت زوال!" مجمعے سے کوئی بولا۔

آؤ۔۔۔۔ عصر کی نماز پڑھیں۔" کسی دوسرے نے کہا۔

آستینیں چڑھا کر مومن ٹونٹیوں کے سامنے بیٹھ گئے۔

O

یہ فارم تو پرائی زبان میں ہے صاحب جی۔ میں اس کا کیا کروں۔ ویسے اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ آپ ان گوروں کو تو روک ہی

نہیں رہے۔ وہ مسلسل گزرے چلے جارہے ہیں۔ ان کے ملک میں ہوتے ہیں تو وہ ہمیں پیچھے کر دیتے ہیں۔ لائن سے نکال کر الگ کھڑا کر دیتے ہیں۔ اب اپنے ملک میں آئے ہیں تو آپ نے بھی لائن سے الگ کر دیا ہے۔ آپ ہمیں پیچھے کر رہے ہیں۔ ہم سے کیا غلطی ہو گئی ہے کہ آپ نے ہمارا ٹھپہ روک لیا ہے۔ گوروں کے لیے یہ کیوں ٹھکا ٹھک چل رہا ہے۔ کیوں صاحب؟

O

لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکی تو نقاب پوش باہر نکلا۔ اب اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھی۔ ایک باوردی دربان بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور سر جھکا کر اطلاع دی۔ ”پجیرو پورچ میں موجود ہے“۔ سر ہلاتے ہوئے نقاب پوش نے اپنی جیب سے موبائل ٹیلی فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کیا پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا ”میں پھول چننے کے لیے جارہا ہوں۔“

ٹیلی فون کا ایریل سمیٹتے ہوئے وہ پورچ کی طرف بڑھا۔ پھر اس نے پجیرو سٹارٹ کی اور شہر کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔

O

ڈیوٹی ختم کر کے حاجی لطیف ہوٹل سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ چوک میں کیڈلک کھڑی ہے اور تمام شہری دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ کو نیت دیکھنے پر اصرار تھا تو دوسرا گروہ عمل دیکھنے کا تقاضہ کر رہا تھا۔ وہ گھر کے قریب پہنچا تو اسے کاؤبوائے بھی نظر آ گیا۔

”تم نے نماز پڑھی؟“ اس نے ایک نوجوان سے پوچھا۔

”نہیں!“

کاؤبوائے نے پستول نکال کر گولی چلا دی۔

” سالا!۔۔۔۔۔ اسلامی ملک میں رہتا ہے اور نماز تک نہیں پڑھتا۔“

چوک میں چلنے والے لوگ رک گئے۔

” واہ!۔“ ایک راہ گیر بولا۔۔۔۔۔ ”کیا حق بات ہے!“

”حیا کر حیا۔ حق بات! بچے یتیم ہو رہے ہیں۔ یہ حق بات ہے؟“

” چلو جانے دو۔“ کسی نے دخل اندازی کی۔

” کیوں جانے دو؟۔۔۔ قابو کرو اس بدمعاش کو“ ہجوم میں سے کوئی چلایا۔ ایک قہقہے کے ساتھ کیڈلک سٹارٹ ہوئی۔ اس کے روانہ ہوتے ہی ہجوم دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ ریڈ کارپٹ کی طرح بچھ گیا اور دوسرا گارڈ آف آنر کے دستے کی طرح تن گیا۔

O

آپ ٹھیک نہیں کر رہے صاحب جی۔ آپ مجھے میرے گھر میں داخل ہونے سے روک رہے ہیں۔ یہ میرا وطن ہی نہیں میرا گھر بھی

ہے۔ میری جان ہے۔ میری پہچان ہے۔ ہر سال میں چودہ اگست اور تیئس مارچ کے جلسے میں شامل ہوتا ہوں۔ ''سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد'' ترانہ مجھے زبانی یاد ہے۔ ''پاک سرزمین شاد باد'' کی دھن بجتی ہے تو میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ پاکستان سے روانہ ہوتے وقت میں قومی اور ملی نغموں کی کیسٹ ساتھ لے کر گیا تھا۔ انڈین فلموں کی بجائے میں پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام دیکھتا ہوں اور آپ ہیں کہ پھر بھی مجھے پاکستان ہی کے ایئرپورٹ پر روک رہے ہیں۔ آپ نے اب تک جو کچھ مجھے کہا ہے میں نے کیا ہے اور آپ نے۔۔۔۔۔ آپ نے اب تک وہی کچھ کیا ہے جو کچھ لوگوں نے آپ سے کیا ہے۔ میری تو گورے مجبوری ہیں کہ میں ان کے ملک میں رہتا ہوں لیکن آپ کو کیا مجبوری ہے۔ آپ تو اسلام کے قلعے کے محافظ ہیں۔ آپ کیوں وہ وہ کچھ کرتے ہیں جو گورے آپ سے کہتے ہیں؟

O

حاجی لطیف گھر پہنچ کر بہت حیران ہوا۔ اس کا بیٹا ابھی تک ایئرپورٹ سے واپس نہیں آیا تھا جہاں پر وہ اپنے چچا کو لینے کے لیے گیا تھا۔ پریشانی کے عالم میں حاجی لطیف ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

'' ٹھہر جاؤ!'' یکدم اس نے ایک دھاڑ سنی۔

وہ ٹھہر گیا۔ اس کے سامنے کاؤبوائے کھڑا تھا۔

'' اسلام علیکم!'' حاجی لطیف جلدی سے بولا۔

''نماز پڑھی تھی تم نے؟'' کاؤبوائے نے سلام کا جواب دیئے بغیر پوچھا۔

''باجماعت پڑھی تھی جناب۔'' حاجی لطیف جلدی سے بولا۔

'' کلمہ سناؤ!''

حاجی لطیف نے سنایا۔

'' زکوٰۃ دیتے ہو؟'' کاؤبوائے نے پوچھا۔

''میں نے حج کیا ہے سرکار۔'' حاجی لطیف لجاجت سے بولا۔

'' تو تم زکوٰۃ نہیں دیتے؟'' کاؤبوائے نے پستول نکال لیا۔

زوردار بریکوں کی آواز کے ساتھ ایک پجیرو وہاں آ کر رکی اور اس میں سے کلاشنکوف لیے ایک نقاب پوش باہر نکلا۔ اس کے نشانے کا ہدف کاؤبوائے تھا۔

'' چلو!'' اس نے کاؤبوائے کو پجیرو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کاؤبوائے پجیرو میں بیٹھ چکا تو نقاب پوش نے موبائل ٹیلی فون پر ایک نمبر ڈائل کیا اور بولا: پھول مرگیا ہے۔ میں نے اسے اپنے کالر پر سجالیا ہے۔''پھر اس نے حاجی لطیف کی طرف دیکھا۔''

" ارے؟" وہ چونکا۔"تم لفٹ آپریٹر تو نہیں ہو؟"

"جی!جی!۔ میں حاجی لطیف ہوں جناب۔"

"امیگریشن کاؤنٹر پر تمہارا بھائی کھڑا ہے۔۔۔۔۔۔ جاؤ اسے لے آؤ۔"

نقاب پوش نے ایک دوسرا نمبر گھمایا۔۔۔۔۔ اور پجیرو کی طرف بڑھ گیا۔

O

شکر ہے کہ تم ابھی تک یہیں ہو میرے بھائی۔ اگر ایک فرشتے کا ٹیلی فون نہ آتا تو میں اب تک وہاں اندر ہی کھڑا ہوتا۔ توبہ ہے توبہ۔ ڈالر اکاؤنٹ کے فائدے بھی ہوں گے پر آج پتا چل گیا ہے کہ اس کے نقصان بہت زیادہ ہیں۔ جیب میں نقد ڈالر ہوں تو ان کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ سب دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور آنکھیں مسکرانے لگتی ہیں۔ مسافر کا جی چاہتا ہے کہ وہ بھاگ کر گیٹ سے باہر نکلے۔ وطن کی خوشبو سونگھے۔ اپنے پیاروں سے گلے ملے اور سوہنی دھرتی اللہ والا ترانہ گائے۔

O

آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میرا ہی نام حاجی لطیف ہے اور مرد مومن کے بارے میں کچھ ولائتی اخبار نویسوں کو انٹرویو میں پرانی باتیں تھیں۔ آج تو مجھے ایک نیا تجربہ ہوا ہے۔ آج میں نے ایک فرشتے کو دیکھا۔ میں نے اسے پہچانا نہیں۔ اس نے اپنے چہرے پر نقاب چڑھائی تو میں نے اسے شیطان کا آلہ کار سمجھا اور لاحول پڑھی۔ میری اس غلطی کی سزا میرے بھائی کو ملی۔ آج سے میں نے عہد کیا ہے کہ جب کہیں پجیرو، کلاشنکوف یا موبائیل ٹیلی فون دیکھوں گا فوراً دعا دوں گا۔ مجھے تو آج یوں لگا ہے کہ یہ تینوں چیزیں نیک بندوں کا زیور ہیں۔ ان کا احترام ہم سب پر واجب ہے۔

O

یہاں یورپ میں رہ رہ کر تم بہت سی باتیں بھولتی جا رہی ہو اسی لیے تم کچھ باتوں پر شک کرنے لگی ہو حتیٰ کہ فرشتوں کی موجودگی پر بھی شک کرتی ہو۔ بالکل پاگل ہو تم۔ بچوں کی تربیت کیسے کرو گی؟ فرشتے تو وہیں ہوں گے جہاں پر شیطان کے کارندے اللہ کے نائب کو طرح طرح کے دھوکے دیں گے۔ اگلی دفعہ تم میرے ساتھ پاکستان چلنا۔ فرشتے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گی۔ اس دیار کفر میں تمہارا عقیدہ کچھ خراب ہونے لگا ہے۔ اب کچھ کرنا پڑے گا۔

غزلیات

مظطر عارفی

سناٹوں سے کہہ دو یہ گھر میرا ہے
دل دیواریں میری ہیں در میرا ہے

میں خود ہی مدفون ہوں گھر کے آنگن میں
نیزے پر جو رکھا ہے سر میرا ہے

میں ہی صف بستہ ہوں سوچ سمندر میں
ساحل پر بھی پیاس کا لشکر میرا ہے

جس کی ضرب سے اندھیارے مسمار ہوئے
وہ آنسو وہ آنکھ کا پتھر میرا ہے

میرے نام پہ قدغن ہے اخباروں میں
اور خبروں میں ذکر بھی اکثر میرا ہے

میں ہی جاگ رہا ہوں عہد اذیت میں
حد نظر تک سارا منظر میرا ہے

اونچے محل منارے چکنا چور ہوئے
صحیح سلامت اب بھی چھپر میرا ہے

رشید قیصرانی

یہ کون سا سورج مرے پہلو میں کھڑا ہے
مجھ سے تو رشید اب مرا سایہ بڑا ہے

تو جس پہ خفا ہے، مرے اندر کا وہ انسان
اُس بات سے مجھ سے بھی کئی بار لڑا ہے

دیکھا جو پلٹ کر تو مرے سائے میں گُم تھا
وہ شخص جو مجھ سے قدوقامت میں بڑا ہے

صدیوں اُسے پالا ہے سمندر نے صدف میں
پل بھر کے لیے جو مری پلکوں میں جڑا ہے

خورشید کے چہرے پہ لکیریں ہیں لہو کی
خنجر سا کوئی رات کے سینے میں گڑا ہے

اک لفظ جو نکلا تھا صفیں دل کی اُلٹ کر
مدت سے مرے لب پہ وہ بے جان پڑا ہے

ٹکرا کے پلٹتا ہوں لگاتار اِدھر سے
یہ سنگ صفت کون سرِ راہ کھڑا ہے

مبارک عابد

ہر کُنجِ رہگزر میں تجھے ڈھونڈتا پھرا
ہر گاؤں ہر نگر میں تجھے ڈھونڈتا پھرا

شاید نہ دِکھ سکا ہو مجھے آنسوؤں میں تو
میں اپنی چشمِ تر میں تجھے ڈھونڈتا پھرا

ہر اِک غزال صفت سے پوچھا ترا پتہ
ہر آہوئے نظر میں تجھے ڈھونڈتا پھرا

ہر صبحِ دشت و در میں کیا ہے تجھے تلاش
ہر شامِ بحروبر میں تجھے ڈھونڈتا پھرا

جب میں تھا یا تھا عالمِ تنہائی بسیط
اُس گنبدِ بے در میں تجھے ڈھونڈتا پھرا

تو پھول بھی تھا چاند بھی شاید میں اس لیے
ہر شام ہر سحر میں تجھے ڈھونڈتا پھرا

تُو تو مزے سے چل دیا مجھ کو ملے بغیر
اور میں جہان بھر میں تجھے ڈھونڈتا پھرا

صابر ظفر

اور کیا اس کے سوا بے وطنی ہوتی ہے
دھوپ بن جاتی ہے جو چھاؤں گھنی ہوتی ہے

ایک پل ہوتا ہے خوشبو کی شہادت کا مگر
عمر بھر کے لیے زنجیر زنی ہوتی ہے

رات بھر رنگ اچھلتے ہیں ملاقاتوں کے
صبح ہوتی ہے تو تصویر بنی ہوتی ہے

نہیں آتا ہے کسی دوسری خلوت کا خیال
جب تصور میں تری گل بدنی ہوتی ہے

خوش خرام آتا ہے جب کوئی ، سرِ کوچہء یار
چادرِ نور بہت پہلے تنی ہوتی ہے

وہ مشقت بھی محبت تھی جو ممکن ہوئی تھی
آج عشاق سے کب کوہ کنی ہوتی ہے

موج میں آئی ہوئی وصل زدہ چشمِ غزال
صورتِ رنگِ عقیقِ یمنی ہوتی ہے

زندگی کی گئی پابندِ سلاسل ایسے
جیسے عورت کوئی بے جرم ونی ہوتی ہے

بانٹ دیتے ہیں محبت کی وجودی لہریں
ماہی گیروں کی طبیعت ہی غنی ہوتی ہے

آ بھی جاتا ہے وہ باوصف تغافل کے کبھی
اکثر اوقات تو وعدہ شکنی ہوتی ہے

دل میں ذراتِ جدائی نہیں آتے ہیں ظفر
سانس جب عشق کی چھلنی سے چھنی ہوتی ہے

جمیل الرحمان

کب سے ہے اپنی ہوا میں وہ کہاں رہتا ہے
کیا ہیں اُس گھر میں دریچے بھی جہاں رہتا ہے

آخرِ شب سہی کیوں بزم سے لوگ اٹھنے لگے
قصہ باقی ہے ابھی ذکر زیاں رہتا ہے

پوچھتا ہوں کہ گلی بھی ہے وہی گھر بھی وہی
عمرِ رفتہ کا بھی کیا کوئی نشاں رہتا ہے

چار موسم تھے یہاں تیرے طرف داروں میں
ایک موسم ہے مرا جس کا بیاں رہتا ہے

دستخط ایسے نہ کر اُس کے اماں نامے پر
اک ذرا سوچ کہ دل درپئے جاں رہتا ہے

ابر پاروں سے بنا لیتی ہے تصویریں ہوا
اور فضاؤں میں نمائش کا سماں رہتا ہے

قریہ ء جاں کو بہم اور ہے اک عکس جمیل
زندگی تیرے لیے کون یہاں رہتا ہے

ظفر خان

راستے کا گماں اُتر جائے
سامنے کا دھواں اُتر جائے

آئینے میں رہے رہے نہ رہے
آنکھ سے بدگماں اُتر جائے

تیری خاطر تو اے سراب یہاں
ریت میں کارواں اُتر جائے
ابر کُھلتا نہیں کہ گلیوں سے
بارشوں کا نشاں اُتر جائے

شاخ پر کوئی حق نہیں اسکا
شاخ سے آشیاں اُتر جائے

اک شجر تک کسی طرح پہنچے
چاہے پھر سیلِ جاں اُتر جائے

گھاس کی پتیوں سی ہریالی
روح میں تاکراں اُتر جائے

منتظر ہیں کہ غم کے چہرے سے
سایۂ مہرباں اُتر جائے

تیر ترکش میں جب نہیں باقی
ہاتھ سے یہ کماں اُتر جائے

اشک بہتے ہیں بات بات پہ اب
سطحِ آبِ نہاں اُتر جائے

مسکراؤ کہ اُسکی پلکوں سے
دید کا امتحاں اُتر جائے

آفتاب احمد اختر

زباں شبنم خیال خاطر احباب رکھتا ہوں
علاج نوع انسانی کا دل میں خواب رکھتا ہوں

تخیل مسجد و منبر بدن محراب رکھتا ہوں
میں اپنی ہر عبادت میں بھی کچھ آداب رکھتا ہوں

بھلا کرسب گلے شکوے وہ باتیں بیوفائی کی
میں دل کی شادمانی کے یہی اسباب رکھتا ہوں

ہوا میں جو بکھر جاییں وہ تنکے میں نہیں رکھتا
جنہیں تعبیر مل جائے میں ایسے خواب رکھتا ہوں

بھنور سے دو بدو ہونے کا دل میں ولولہ بھی ہے
کوئی ساحل کنارا بھی - پس گرداب رکھتا ہوں

میں رکھتا ہوں گما ں یہ زندگی ھے مختصر کتنی
تو شاید اس لیے بھی مختصر اسباب رکھتا ہوں

میں اپنے مہروماہ انجم فلک سے ڈھونڈ لاتا ہوں
مہم جوئی کو بھی کچھ منزلیں نایاب رکھتا ہوں

مجھے گزری ہوئی راتوں کی یادیں اب ستاتی ہیں
بھلے اختر میں ان یادوں کو بھی کمیاب رکھتا ہوں

Prof. Dr. Saadat Saeed

Search for identity - 1
Saeed Anjum's Short stories

Walking Sleeping Dreams: (سوتے جاگتے خواب)

Saeed Anjum has left this world early. Now he is living in our memories. He tried various fields of expressions to embody his ideas concerning the future of mankind on earth. He began his literary carrier as critic and short story writer and remained faithful to these forms of literature till his last breaths. He was my close friend. We both started our literary flight under the careful vigilance of the teachers of our honorary alma Mater Halqa Arbab-e-Zauq Lahore in late sixties.

Those of course were the painful days of Ayub's Martial Law in Pakistan. In early seventies I joined Young People's Front a Lahore based pro China leftist group of intellectuals under the leadership of Dr. Aziz- Ul- Haq (a Canada return socialist critic and the author of Mazmeen-e- Azizul Haq whose first and last book was published many years after his murder by an industrialist in May 1972) and Saeed Anjum Pro Moscow socialist party and took political lessons from C.R Aslam and Abid Hassan Manto. Our blood was young and we remained involved in heated theoretical discussion up till the dismemberment of USSR. Later we embraced too the theory of glasnost presented by Gorbacheve. Saeed Anjum went to Norway. I remained in Pakistan. Later I met him several times in Norway and Pakistan.

Through his courtesy I met Sain Sucha and Nasar Malik. He hosted me twice in Norway. I traveled

with him from Oslo To Stockholm. Saeed Anjum, Akram Chaudary (Our common friend living in Oslo) and I roamed in and around Oslo near about fifteen precious days. Those days have gone with the wind. Everyone has to leave this world one day. Only the time will embrace eternity.

Saeed Anjum was a good fiction writer. When his maiden book "Sab Acha Ho Gaa" published I arranged an evening with him In Halqa Arbab-e-Zauq Pakistan in Cheney's Lunch Home Lahore. I read an article about his achievements. Later that article was published in my book Jayhat Numaee under the title of Seena-e-Geeti Main Naey Din Kay Naey Khawab". A few years later when Saeed's second book "Sotay Jaghtay Khawb" published I wrote an article about his short stories, which was published in "The News International Lahore". I present hare that article for readers having taste to understand contemporary literature.

When we enter the world presented in modern fiction we often find life and living souls in deep crisis. Amidst the modern culture, which is blossoming like self-growing plants, we face vulnerable voices crying for help. Living in the center of mechanical presence they call for humanity. They madly hanker after the values of humanism. Their corporeal living prevents them to adopt the ways parallel to materialism. In the age of pure nationalism everyone among emigrants residing at various parts of the world is in search of ones human identity. Living in a country culturally alien to him. He faces different conditions and environment. He and people like him ask themselves as Sain Sucha, a well known writer of Punjabi and English, puts it in his famous book "search for identity" that "are they basically birds of the same feather or the acquired plumage from their new home-grounds have brought about such a radical change that they can no longer fly together? Can they still call themselves as Oriental, or have they become westernized.
Explaining his subjective crisis Nasar Malik, a short story writer, poet and broadcaster writes:

You, who hunt me!
You. who lie in wait!
The day you kill me.
in my pocket you will find
a ticket to Loveland.
Love Land — cradle of peace.
Land — of human conscience.
Listen!
Throw not away that ticket!
You can also travel on it.

The killer doesn't need that ticket as Franz Fanon writes in his famous book the "Wretched of the Earth" that they should not waste their time in futile supplications and filthy imitation. Leave Europe to its fate. That there people talk a lot about humanity but wherever they find human being they kill him. In the name of so-called spiritual issues — on a road corner or everywhere in the world- they have entangled humanity.

When we read latest short stories by Saeed Anjum. We feel how difficult it is to live in a foreign country as an alien migrant. A few years ago Saeed's maiden book of short stories "Sub Achha Ho Ga" was widely appreciated by well-known Urdu critics. The second book contains his thirteen short stories and eleven mini short stories have been published under the title of Sotay Jagtay Khawb (Walking Sleeping Dreams). Besides the expressions of love for his motherland the writer presents in them the day-to-day problems encounter by the emigrants living in Norway. It is a register actuality that the documentation of life in art and literature does not demand the embrace of inconceivable theorem for its expression. A genuine writer never disregards the vital questions of existence and quest for facts. Saeed's creative mind works wonders and the hidden facts and truths become the part of his creations charged with the concepts of so-

cial responsibility and political commitment. He has made a bold attempt to mirror the world experienced by him. In the process of writing the facts and truths discovered by him. He uses completely the creative right of surpassing the common limits. In his introduction of Saeed's short story " AKhbar AA Giaa (The news paper is in hand) the Editor Shair (Short Story Number) Bombay writes " In Saeed's short stories we find a continuous process of retrieving lost character.

His short stories are founded on the concepts of the basic thought of modern mind, and the representation of his culture and the artistic expressions of its preservation. The waiting for the unity of the contradictory dimensions of dream and its interpretation and aspiration for betterment have protected his style from unnecessary complexities and placed it in main stream of common likeness. Saeed Anjum seems to be well aware of the mode of contemporary political and social changeover and disorder around the globe. Furthermore he reacts sharply to the traditional sanctimonious dispositions. His short stories "Naik Bandon Ka Zaiwar", "Fursh-o-Arsh" and a few others depict clearly his progressive approach about metaphysical problems. In his latest short stories the subject of his main concern is the problem of disgraceful living of alien immigrants in the societies famous for their philanthropic spirit. Here we present translation of his two mini short stories. Returning back to home from Nursery my son ordered me in Norwegian language

"You cannot go out"

"Why"

Speaking Urdu I stared at my wife who had brought him back.

Child Said "We will play together"

And mother was suggesting to accept his idea.

"What we are going to play"?

Postponing my program of leaving house I asked.

" Red Indian and cowboy"!

The child told me.

On that evening I was killed several times by my son.

Later I asked my wife

" Doesn't he find opportunity to play in Nursery?"

" He finds it"

My wife told me

" But Norwegian children use to make him Red Indian all the day".

(Play)

During the Immigrants Cultural Festival Ali charmed audience with the strings of Sitar. A year after he got a letter from the National Cultural Administration. He was invited to participate in a seminar along with Norwegian artists. The term Cultural Worker was used for him in the invitation. He was amply happy over it. He put required things in his bag and reached at charming Hotel situated in a beautiful area far away from Oslo and entered in it as a cultural worker the new status given to him. He told his name. The receptionist checked the list of invite and gave him a key. He left for the room reserved for him. According to the schedule he has to reach for taking his evening meal in the dinning hall at 6 0 clock. He took bath and singing a light tune combed his hair. Check his dress and watched the watch and went towards dinning hall. Many people were sitting here. He stayed for a while and began to search any familiar face. Norwegians waved their hands towards him. He went near their table. One of them asked him " Bring menu".

Saeed Anjum expresses his truths and opinions freely. He belongs to the progressive traditions projected by the liberal and progressive members of Halqa Arbab-e Zauq and progressive writers movement. So he is extremely bold in his expressions. His cutting approach in literature motivates him to adopt the methodology of criticism and self-criticism to discover the real facts hidden in the lairs of complex politi-

cal, social and metaphysical situations. Saeed's evaluation of his crisis oriented existing situation brings about the wanted impact. He calls in question the scattered opinions and assertions of western writers about the problem of alienation and exile and focuses his attention on disturbing consequences faced by immigrants living in alien soils. It is a known fact that the movements in modern fiction with their geneses in the capitalist cosmos concentrate upon the delineation of one's individuality. But in spite of their belligerent claims the novelist from West could not touch the problems faced by immigrants. For them immigrants are non-entities. How can they comprehend their individualistic or collective confusions and crisis.

In 19th century Karl Marx expounded his famous theory of alienation in his notable book Philosophical Manuscripts Though this theory deals with the passion of individual's alienation in the industrial society yet its implications suggest that Karl Marx was in search of lost humanity. He voiced against slavery system. But most of the writers in West could not sight new type of slavery. These slaves are invisible for them. They only can hate them or ignore them. The painful alienation told heavily upon the individualities of the workers from third world. They are craving for a whisper of fresh air.

Sain Sucha in his book Search for identity has theorized the situations encountered by the immigrants residing in various affluent countries. He points out:

"There was a general consensus that although the act of emigration is an extremely painful experience, on the whole it added to the personality of each being."

He further says

"we all have left our homes, with some precious gems of truth to help us survive in the strange lands of alienation; yet our entrance into the bigger world has brought us face to face with so many other shades of truth that one could no longer assert that the truth had only one identifiable form or facet. All that was new and caught attention was not always golden, but it aroused curiosity and stirred the imagination."

Saeed Anjum seems well aware of latest theories of alienation and social change. At times he analytically uses Existentialist doctrine of human freedom and commitment. He knows where lies his identity. In his short stories he depicts well the characters, which are in search of identity. He gives countenance to the theories of alienation and human dignity presented by Franz Fanon. Eric Fromm. Herbert Marcuse and many other humanists.

As we know writers portray life in the perspective of polite progression. Saeed Anjum too had criticized unjust society around him. As a critic he theorized intellectually the problems concerning despotism and class system in third world. He revolted against autocratic ethical patterns and tried to point out the nature of real ethical patterns. He in his two expressive short stories entitled "Jalti Bujti Rooshanian" and "Aab-e-Shifa" propounded creatively his well thought critical views. Conscious readers can easily discover his analytical awareness about the uneven social situations and hidden human demands. After thorough study of Marxism Saeed Anjum told his readers clearly that they had to resolve the problems of dichotomy related to practice and lesson of morality in a materialistic society. He exposed in his various short stories the dual morality concealed by the religious propagandists. As a short story writer his critical approach though looks simple but has deep analytical studies.

Searching For Home: The Ahmadiyya Community's Struggle To Escape Prosecution

Ahmadis in Pakistan have to face violent bigotry and discrimination. As some flee to Sri Lanka to escape Pakistan's ruthless mobs, they are finding that the path to safety is rife with struggle.

by Asim Ahmed Khan & Sandran Rubatheesan

It was when Rizwan Akram Hanjra realized that his whole family, including five children, were in imminent danger after a house robbery attempt that he decided to leave once and for all. Rizwan was born and bred in Fort Abbas, in Punjab province, Pakistan, one of the two provinces where Ahmadis live in large numbers.

He had been running an engine spare parts shop successfully for years when suddenly, his whole life turned upside down. Traders in the Tufail town of Fort Abbas where his business was located found out he belonged to the Ahmadi community, which has long been persecuted and outcast in Pakistan.

After that, traders refused to do business with him; even the local tea stall would not serve him tea or fruits. His children were thrown out of school by the principal with a note saying there was no place for Ahmadis.

To make matters worse, when he went to pick them up at school on November 29, a group of people assaulted him mercilessly. "It was a miracle that I survived," said Hanjra.

By selling the family's traditional land and business he had owned, he was able to raise funds to arrange for the whole family to leave the country.

Rizwan Akram Hanjra with his children. Source: authors

As Sri Lanka marked its 75th anniversary of independence from the British on February 4, his family of eight, including his wife, five children and his father, landed at Bandaranaike International Airport with hopes for a better life, mixed with uncertainty in a foreign land.

From the little savings he has, Hanjra can provide for the family for three to four months. After that, "I don't know how I am going to support them," he told *The Friday Times* from the local Ahmadi mosque in Negombo, located some 40 kilometers from the capital Colombo.

In Sri Lanka, Hanjra and his family face other obstacles to a better life.

Under Sri Lankan regulations, refugees and asylum seekers are not allowed to work and their children cannot be admitted to local schools. His three sons and two daughters are homeschooled by his wife, Fouzia Talat, an M.A. graduate in English literature.

"My children are really good at studies and were studying in an international school, but they were thrown out because of our identity. If someone picks them out, they shine like a diamond," the proud father said.

"We are not safe from Pakistan even in Sri Lanka, so I asked the UNHCR office what we can do to process my application quickly, but have received no satisfactory response from them."

His wife worked as a teacher back in Pakistan. “But due to our religion, I could not continue it any longer. Currently, I’m homeschooling our children but the situation here is also not good since everything is very expensive,” Fouzia said.

“Back home, they don’t consider us as Muslims and brand us as kafir (non-Muslims), even though we pray like them and engage in religious activities similarly,” said Hajra, the only son in the family, whose ailing father had to sell his livestock since no one was willing to buy milk from his farm.

Even though both countries have witnessed the worst economic crises since independence and currently are undergoing International Monetary Fund bailout programs, for Ahmadi refugees, the situation is getting worse by the day.

“The current situation there [Pakistan] is very bad and many in our community want to leave, but they don’t have enough financial resources,” Hajra explained. He noted that Ahmadis are the worst off due to the discrimination they face and the plight of discrimination that can very easily turn violent.

The ongoing economic crisis in Sri Lanka, where the cost of living has skyrocketed, coupled with high inflation, is a double whammy for refugees who are totally dependent on charities or donations for daily survival in addition to support from relatives back home.

For the family of eight, Hanjra is paying Rs 30,000 for the rented house, about 28,814 Pakistani Rupees, per month in addition to Rs 12,000, another 11,525 Pakistani Rupees, and Rs 3000, or about 2,881 Pakistani Rupees, for electricity and water following the recent tariff hike.

Even in their temporary host country, things are not so good. Hanjra is concerned about his family’s security following a recent incident where his children were not allowed to use the local play area due to their identity by local Muslims.

“We are not safe from Pakistan even in Sri Lanka, so I asked the UNHCR office what we can do to process my application quickly, but have received no satisfactory response from them, ” said Hanjra.

He registered as an asylum seeker with the local UN refugee office, but still awaits further processing procedures on his application. That may also be a problem for him.

Hanjra heard a rumour that the local UNHCR office will stop accepting new entries of asylum seekers and refugees and is preparing to close by the end of this year. There are many Ahmadis waiting for UN approval.

Nazir Mehmood, 48, a teacher from Kot Pedda Narowal, arrived in Sri Lanka in 2017 and has been waiting over three years for a response from the local UN Refugee Agency office on his appeal after his initial application was rejected.

In addition to being an Ahmadi, his love marriage to a Sunni woman doubled the life threats to the young family even from neighbors and relatives back home.

Nazir Mehmood. Source: authors

For the past six years, his relatives, particularly a sister from Australia, have been supporting the family, "But I cannot expect her to do this any longer," said Mehmood. "The UN office should fast-track the cases which are pending for many years as it is incredibly difficult for us to survive here. Mehmood and his wife have an only child, a daughter born in Sri Lanka. The parents worry about her future as she is not allowed to go to school. "I am worried about her future," her father said.

According to official government statistics, among the 845 refugees in Sri Lanka, at least half of them are Ahamediyyas who came from Pakistan to escape persecution.

Ahmadis face obstacles on two fronts: the ongoing economic crisis in the host country makes the already precarious task of leaving their homeland behind even harder. Highly volatile ethnic tensions are another major concern for their safety.

After the Easter Sunday attacks that shook the nation in 2019, leaving 272 dead and 407 injured in suicide attacks carried out by a radical Muslim group, the Ahmadediya refugee community has felt especially vulnerable.

A Catholic church in Negombo, where many of the Ahmadis lived, was among the targeted

shrines. Many had to move to temporary locations to escape the angry mobs.

With their six month old baby, Mehomood and his wife were temporarily shifted to Vavuniya, Sri Lanka's northern province to ensure their safety. The couple spent nearly six months before relocating to a rented home in Negombo.

Ahmadi temporary shelter in Negombo with poor facilities. Source: authors

In the week of May 23, a group of refugees and asylum seekers, including children, staged a protest in front of the country office of UNHCR in the capital Colombo following reports that the Mission is scheduled to wind up its operations in Sri Lanka by early next year.

Demanding relief in view of the ongoing economic crisis and education for the children, protesters urged the UN Refugees Agency to fast-track the process of their refugee status and provide a speedy solution to the permanent settlement before the closure of the office in the host country.

"Irrespective of where they have come from, UNHCR has a big responsibility to ensure the safety and permanent settlement of refugees who are currently recognized by it before the office's closure. Many lives are in limbo, particularly the children of refugees," Ruki Fernando, a human rights activist told *The Friday Times*. He noted that some refugees have been living on the island for over 10 years awaiting a response from the UN agency on their asylum applications abroad.

Fernando stressed that the Sri Lankan government has a moral obligation to protect and ensure the well-being of refugees as thousands of Sri Lankan citizens fled the country as refugees and sought asylum abroad during the decades-long conflict in the past.

"Children of refugees should be allowed to pursue education in local schools during their stay. Refugees who have skills and talents should be allowed to work in order to lead a life with dignity here. What Sri Lanka is currently doing is not enough," Fernando said. Some Ahmadis find strength in their strong religious beliefs.

"It is their faith that kept them going despite all these difficulties and new challenges these days," says Nizam Khan, president of Ahmadiyya Muslim Jamaat – Sri Lanka, an outfit dedicated to the welfare of the refugee community, by coordinating donations from charities to manage economic hardships.

"Most of the refugees came here to Sri Lanka after making previous arrangements back at home, or through family connections. The economic crisis in the country makes daily lives very difficult to the extent that many families had to shrink their essential needs and expenses significantly," Khan observed.

With the wide-scale displacement situation in Sri Lanka over and the majority of internally displaced people returning to their places of origin, UNHCR said that it is "now able to review its presence in the country." "UNHCR is aware of refugee concerns and continues to engage to address these issues. We urge for peaceful dialogue to address all concerns linked with refugees, asylum seeker protection and welfare," the Country office said.

Despite an unprecedented economic crisis crippling Pakistan, hundreds of Pakistani-Ahmadis are desperate to leave the country even if it means facing similar hardships in a temporary transit point in search of a better future. Some, like Rehan Ahmed, 36, hold out as long as they can before leaving.

Rehan ran a mini grocery store in Sheikhupura, a city in Punjab province with a population of nearly half a million. He never considered leaving home until the situation began deteriorating in recent years and survival became a daily struggle.

A member of the Ahmadiyya community, Rehan had always faced discrimination and threats but despite the challenges, he had managed to build a life for himself and his family. But the constant fear and insecurity had taken a toll. He yearned for a place where he could work freely and safely.

The economic crisis in Pakistan has had a profound impact on Rehan's plans to leave the country.

With limited financial resources, it became increasingly difficult for him to gather the funds to relocate his family to a safer place. The declining value of the local currency made it even more challenging.

Rehan explored various avenues to secure a visa and relocate his family, but the economic crisis made it harder for him to meet the financial requirements imposed by immigration authorities.

He reached out to international organizations and human rights groups for assistance, hoping to find support. His pleas went unheard.

"The economic crisis may be a hurdle, but it won't dampen my determination to create a safer and more prosperous life for our children. I'll find a way, no matter what the challenges are," Rehan said. He has a family of seven, parents from both sides, his wife and three children.

"Leaving our country is not an easy decision, but when our safety and the future of our children are at stake, we must consider all options. We deserve the freedom to practice our faith without fear," he said. Recently, Rehan's prayers were answered.

Hearing of the family's plight, a local community organization came forward to assist in paying for a one-way ticket to a safe country.

The Ahmadis of Pakistan have always known that they were not accepted by the mainstream Muslim community. They have been ostracized, discriminated against, and even targeted with violence. But in recent years, the situation has worsened. The government has passed laws that explicitly targeted the Ahmadi community, and religious leaders called for their persecution.

Despite the obstacles, Ahmadis have struggled to establish a safe haven in their homeland, hoping to find safety in numbers.

The road leading to the residential area of Rabwa is filled with small shops and tea stalls. Auto rickshaws and motorcycle-driven auto *tongas* wait for passengers outside a large hospital at the start of the town. The medical facility is operated by the Ahmadiyya Muslim Community and serves many patients every day, including non-Ahmadis from nearby towns and villages.

Rabwa is home to around 70,000 Ahmadis, who seek refuge in the town when they feel unsafe elsewhere in Pakistan. "Rabwa is a temporary shelter and a safe haven," says Hammad Ali, spokesperson for the Ahmadiyya Muslim Community in Rabwa. "The Ahmadi community feels a sense of security here because we live together."

Even the dead from the Ahmadi community are subjected to atrocities.

Once again, violence became the invader. In 2014, an Ahmadi cardiologist, Dr. Mehdi Ali, was assassinated as he was leaving a graveyard outside the town. Two years later, a 26-year-old Ahmadi, Bilal Ahmed, was shot dead on a street in Rabwa while on his way home from work.

The Ahmadiyya Muslim Community established Rabwa as their headquarters in 1948 on land purchased from the government. "The town was meant to serve as a center or foundation for the Ahmadiyya movement," says Ali.

According to the 1998 census, the population of Ahmadis was 286,212 but the number decreased to 167,000 in 2017 while the country's population stood at 130,857,717. At least 10,205 changed their religious status from Muslim to Qadiani (Ahmadi).

However, Ahmadiyya Jamaat spokesperson for Amir Mehmood disputed the government figure saying that the number is very small if we look at the calculation of the natural increase of the population. "Of course, people are migrating due to persecution, but this process has been going on since 1980."

The population of the Ahmadi community in Pakistan is around 400,000, Mehmood estimated. According to the Election Commission of Pakistan, the number of Ahmadi voters was 167,000 in 2018, with the majority of the community residing in the two largest provinces in the country: Punjab and Sindh.

According to statistics compiled and provided by Jamat Ahmadiyya, 325 people were booked and over 200 arrested in a total of 75 First Information Reports (FIRs) registered against the Ahmadiyya community under blasphemy charges and the Pakistan Electronic Crimes Act since 2018.

Even the dead from the Ahmadi community are subjected to atrocities. The Human Rights Commis-

sion of Pakistan, an autonomous organization that monitors the human rights situation in the country, found that 92 Ahmadiyya graves and 10 Ahmadiyya worship places were desecrated, and 25 cases (FIRs) were registered against 105 Ahmadis on religious grounds last year alone.

After years of struggling, facing constant threats, and fearing prosecution, Rehan Ahmed is ready to leave his home country to find shelter in Belgium with the support of local organizations. He received the necessary legal documentation, allowing him to work and reside. It is a relief for him to no longer live in constant fear, and he is determined to make the most of this newfound freedom.

"Leaving my homeland is a heartbreaking decision, but the constant threat to my life as an Ahmadiyya compelled me to take that leap of faith. Thanks to the invaluable assistance of various organizations, I will now breathe freely, knowing that my fundamental rights will be protected."

Escaping Pakistan is not just about finding physical safety; it is about reclaiming my dignity and freedom," Rehan said.

Rehan's journey to Belgium will not be without its difficulties, but he has high hopes that the supportive environment and opportunities the foreign country offers will enable him to rebuild a new life for his family. As he looks back on his journey, he realizes that while the scars of his past would always remain, they had become a testament to his strength and resilience.

(The article was first published in the Friday Times on June 2, 2023)

(Asim Ahmed Khan from Pakistan and Sandran Rubatheesan from Sri Lanka contributed to this story.)

Vol 3, No 3—July 2023
ALMANAR
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA